بیادگار الحاج سید عبدالرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدرآباد

فی پرچہ:۔ پچھتر ۷۵ پیسے

قیمت سالانہ:۔ آٹھ روپے

الرحیم حیدرآباد

| جلد ٦ | ماہ جون ۶۸ء مطابق ربیع الاول ۱۳۸۸ھ | نمبر ۱ |


# فہرست مضامین

# شذرات

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پیغام کو عام کرنے اور اسے ملت کی عملی زندگی میں مشعل راہ بنانے کے لئے شاہ ولی اللہ اکیڈمی نے ۸ مئی سے ۱۴ مئی تک حیدرآباد میں سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۱۹۶۳ء کے اوائل میں قائم ہوئی تھی۔ اس پانچ سال کے عرصہ میں اکیڈمی نے رسائل کے ذریعہ اور حضرت شاہ صاحب کی کتابیں شائع کرکے ولی اللہی تعلیمات سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برعظیم پاک و ہند کے علمی حلقوں کو متعارف کرانے کی مسلسل جدوجہد کی اور انہیں یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ آج اس دور میں اسلامی احیار کی وہی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے۔ جس کی اساس اٹھارویں صدی کے شروع میں حضرت شاہ ولی اللہ نے رکھی تھی چنانچہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں ان دوسو سالوں میں برابر جاری رہا ہے اور آج بھی اس تحریک کے نام لیوا اور حضرت شاہ صاحب اور ان کے خانوادۂ علمی کو اپنا مرشد و رہنما ماننے والے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ضرورت اس فکری و علمی اور اصلاحی و انقلابی تحریک کا صحیح تاریخی جائزہ لینے اور آج کے مسائل اور حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسے ایک زندہ اور فعال شکل دینے کی ہے۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کا دراصل مقصد یہ تھا۔ اب تک یہ علمی خطوط پر اس مقصد کے حصول میں کوشاں رہی اب وہ یہ چاہتی ہے کہ سیمیناروں کے ذریعہ اپنی اس دعوت کو ملت کے

ایک وسیع تر طبقے تک لے جائے۔

---

محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کے ناظم اعلیٰ اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے چیئرمین جناب محمد مسعود صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں اکیڈمی کے زیر اہتمام ہونے والے اس سیمینار کی ضرورت اور افادیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے انقلابی فکر کا صرف کتابوں تک محدود رہنا کافی نہیں۔ اس صورت میں عوام کو اس سے استفادہ کرنے کا کبھی موقع نہیں مل سکے گا۔ اور خود مسعود صاحب کے الفاظ ہیں۔

" ایک ہاری کو جو اپنے کھیت میں اب بھی کسی رہنما کا منتظر ہے، جو اسے فلسفۂ حیات سمجھائے۔ ایک معمولی پڑھے لکھے شخص کو جو زندگی میں رونق اور خوشحالی دیکھنے کا متمنی ہے کون بتائے گا کہ جن چیزوں کو وہ جگہ جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات میں موجود ہے " یہ سوال تھا۔ جس کا جواب شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے کارکنوں نے اس سیمینار کی صورت میں دیا۔ مسعود صاحب نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ یہ سیمینار اس پروگرام کی پہلی قسط ہے۔ اسے صاحب موصوف نے باعث مسرت بھی قرار دیا۔ اور امید افزا بھی۔ ان کے نزدیک اکیڈمی کے اپنے تحقیقی و اشاعتی پروگرام کے ساتھ سیمینار کی صورت میں جس نئے کام کا آغاز کیا ہے اس سے شاہ ولی اللہ کے انقلابی مشن اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ٹرسٹ کے وقف کرنے والے شاہ عبدالرحیم مرحوم کے مقاصد کی تکمیل ہو سکے گی۔

---

مسعود صاحب نے اپنے خطبہ میں خاص طور سے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے ان پہلوؤں پر زور دیا، جن کا تعلق زیادہ تر معاشرے کی خوشحالی اور افراد کی ذہنی و مادی پاکیزگی سے ہے انہوں نے بتایا کہ شاہ صاحب کے نزدیک معاشرہ کا خوشحال ہونا اس کا فطری تقاضا ہے۔ کیونکہ اسی صورت میں افراد معاشرہ کی جسمانی اور روحانی صحت قائم رہ سکتی ہے اور وہ اچھے اخلاق کے مالک بن سکتے ہیں۔ اور یہ کہ جب معاشرے

کے سامنے اس کے تمام افراد کی [illegible] ہیں [illegible] س کے امیر بہت زیادہ امیر اور غریب بہت زیادہ غریب ہو جاتے ہیں، تو پھر ایسے معاشرہ کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ مسعود صاحب کے الفاظ ہیں، شاہ صاحب کے نزدیک ایسے معاشرہ کا ختم ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔ اور خود قضا و قدر بھی اس کے لئے وسائل فراہم کر دیتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ یہ معاشرہ جو روگی ہو چکا ہوتا ہے، ناپید ہو جائے اور اس کی جگہ ایک صالح اور صحت مند معاشرہ وجود میں آسکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا اور آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کے مبارک ہاتھوں سے آج سے تیرہ سو سال پہلے اس کی تکمیل بھی ہو گئی۔

---

جناب محمد مسعود صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ کا اختتام ان الفاظ سے کیا۔ آپ نے فرمایا۔

شاہ صاحب کا فلسفہ عالمگیر ہے، وہ جس نظام حیات کو پیش فرماتے ہیں وہ ٹھوس جاندار ارتقائی اور انقلابی ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی نے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی اشاعت کا جو پروگرام بنایا ہے، اس سے خاطر خواہ نتائج نکلیں گے۔

---

سیمینار کی، اس کے افتتاحی اجلاس کو چھوڑ کر کل گیارہ نشستیں ہوئیں۔ جن میں ممتاز اہل علم نے حسب ذیل مباحث پر اپنے مقالے پڑھے۔

فرد اور شاہ ولی اللہ۔ شاہ ولی اللہ اور معاشرہ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی اور معاشرتی افکار۔ ولی اللہی تحریک۔ شاہ ولی اللہ اور تعلیم۔ شاہ ولی اللہ کے معاشرتی و اقتصادی افکار۔ مقالات کے بعد ان پر تبصرے بھی کئے گئے۔

سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر محمد صالح قریشی صاحب نے

سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھا۔ آپ نے حضرت شاہ صاحب کی علمی۔ اصلاحی اور اجتماعی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاں انہوں نے علم وتحقیق کی بے بہا خدمات انجام دیں، وہاں وہ ایک انقلابی شخصیت بھی ہیں۔ اور اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحب نے قلمی وعملی دونوں طرح کی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر محمد صالح قریشی صاحب نے بتایا کہ شاہ صاحب عالم بھی ہیں اور مفکر بھی اور وہ جو کچھ پیش فرماتے ہیں انہیں پڑھکر آدمی کچھ سوچنے اور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ صاحب موصوف کے الفاظ میں ۔

شاہ صاحب کا یہ انداز جدید بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو شاہ صاحب کے اس تطبیق اور انقلابی فلسفے سے متعارف کرایا جائے۔

جناب وائس چانسلر صاحب نے سیمینار کے انعقاد کا خیر مقدم کیا اور فرمایا۔

یہ دور ایٹم اور مشین کا دور ہے اس وقت لائبریریوں اور کتابوں کی سہولتیں تو موجود ہیں لیکن عام پڑھے لکھے لوگوں کے پاس وقت کم ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو تحقیقی وتدریسی کاموں میں مشغول ہیں۔ باقی پڑھے لکھے لوگ ایک محدود وقت میں شاہ صاحب کے تمام افکار سے، ظاہر ہے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے سیمینار کا یہ سلسلہ بہت موزوں ہے۔

صاحب موصوف نے بتایا کہ اس طرح کے سیمیناروں کا فائدہ یہ ہوگا کہ جہاں ان میں شاہ صاحب کے افکار پر تحقیقی کام کرنے والے جمع ہو سکیں گے، وہاں جو لوگ ان افکار کو سمجھنا چاہیں گے وہ ان سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالات سے استفادہ کر سکیں گے۔ اور اس طرح شاہ صاحب کے افکار کی زیادہ سے زیادہ نشر واشاعت ہو سکے گی۔

اور آخر میں آپ نے یہ توقع ظاہر کی۔

”میری خواہش ہے کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی اسی قسم کے سیمینار

کے سامنے اس کے تمام افراد کی خوشحالی نہیں رہتی۔ اور اس کے امیر بہت زیادہ امیر اور غریب بہت زیادہ غریب ہو جاتے ہیں، تو پھر ایسے معاشرہ کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ مسعود صاحب کے الفاظ ہیں، شاہ صاحب کے نزدیک ایسے معاشرہ کا ختم ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔ اور خود قضا و قدر بھی اس کے لئے وسائل فراہم کر دیتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ یہ معاشرہ جو روگی ہو چکا ہوتا ہے، ناپید ہو جائے اور اس کی جگہ ایک صالح اور صحت مند معاشرہ وجود میں آسکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا اور آپ اور آپ کے صحابہ کے مبارک ہاتھوں سے آج سے تیرہ سو سال پہلے اس کی تکمیل بھی ہو گئی۔

---

جناب محمد مسعود صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ کا اختتام ان الفاظ سے کیا۔ آپ نے فرمایا۔

شاہ صاحب کا فلسفہ عالمگیر ہے، وہ جس نظام حیات کو پیش فرماتے ہیں وہ ٹھوس جاندار ارتقائی اور انقلابی ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی نے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی اشاعت کا جو پروگرام بنایا ہے، اس سے خاطر خواہ نتائج نکلیں گے۔

---

سیمینار کی، اس کے افتتاحی اجلاس کو چھوڑ کر کل گیارہ نشستیں ہوئیں۔ جن میں ممتاز اہل علم نے حسب ذیل مباحث پر اپنے مقالے پڑھے۔

فرد اور شاہ ولی اللہ۔ شاہ ولی اللہ اور معاشرہ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی اور معاشرتی افکار۔ ولی اللہی تحریک۔ شاہ ولی اللہ اور تعلیم۔ شاہ ولی اللہ کے معاشرتی و اقتصادی افکار۔ مقالات کے بعد ان پر تبصرے بھی کئے گئے۔

سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر محمد صالح قریشی صاحب

سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھا۔ آپ نے حضرت شاہ صاحب کی علمی۔ اصلاحی اور اجتماعی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاں انہوں نے علم و تحقیق کی بے بہا خدمات انجام دیں، وہاں وہ ایک انقلابی شخصیت بھی ہیں۔ اور اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحب نے قلمی و عملی دونوں طرح کی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر محمد صالح قریشی صاحب نے بتایا کہ شاہ صاحب عالم بھی ہیں اور مفکر بھی اور وہ جو کچھ پیش فرماتے ہیں انہیں پڑھکر آدمی کچھ سوچنے اور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ صاحب موصوف کے الفاظ میں۔

شاہ صاحب کا یہ انداز جدید بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔ اور ضرورت اس بات کی ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو شاہ صاحب کے اس تطبیق اور انقلابی فلسفے سے متعارف کرایا جائے۔

جناب وائس چانسلر صاحب نے سیمینار کے انعقاد کا خیر مقدم کیا اور فرمایا۔

یہ دور ایٹم اور مشین کا دور ہے اس وقت لائبریریوں اور کتابوں کی سہولتیں تو موجود ہیں لیکن عام پڑھے لکھے لوگوں کے پاس وقت کم ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو تحقیقی و تدریسی کاموں میں مشغول ہیں۔ باقی پڑھے لکھے لوگ ایک محدود وقت میں شاہ صاحب کے تمام افکار سے، ظاہر ہے استفادہ نہیں کر سکتے؛ اس کے لئے سیمینا کا یہ سلسلہ بہت موزوں ہے۔

صاحب موصوف نے بتایا کہ اس طرح کے سیمیناروں کا فائدہ یہ ہوگا کہ جہاں ان میں شاہ صاحب کے افکار پر تحقیقی کام کرنے والے جمع ہو سکیں گے، وہاں جو لوگ ان افکار کو سمجھنا چاہیں گے وہ ان سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالات سے استفادہ کر سکیں گے۔ اور اس طرح شاہ صاحب کے افکار کی زیادہ سے زیادہ نشر و اشاعت ہو سکے گی۔

اور آخر میں آپ نے یہ توقع ظاہر کی۔

"میری خواہش ہے کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی اسی قسم کے سیمینار

کرانے کا آئندہ بھی بندوبست کرتی رہے۔ تاکہ اس علاقے کے عوام میں
علمی و عملی شعور بیدار ہو اور سب لوگ مل کر ایک بہترین ذہنی
علمی اور اقتصادی معاشرے کی تشکیل کر سکیں۔"

---

پروفیسر ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتا نے سیمینار میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ آپ
اہ ولی اللہ اکیڈمی کے ڈائرکٹر ہیں اور سیمینار کا انعقاد آپ ہی کی کوششوں کا
بہ تھا۔ آپ نے ناظم اعلیٰ اوقاف جناب محمد مسعود صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ صاحب
موصوف نے شاہ ولی اللہ کے افکار کی علمی اشاعت کے ضمن میں ان کی تجویز کو پسند فرمایا
ر اس طرح سیمینار کا انعقاد ممکن ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں:-

آج کا یہ سیمینار شاہ ولی اللہ کے افکار کی تحریری، تقریری اور علمی اشاعت
طرف آپ (جناب محمد مسعود صاحب) کے تعاون سے پہلا قدم ہے۔ اس علاقہ
کے لوگوں میں اب انشاء اللہ پھر سے شاہ ولی اللہ کے سنہرے اصولوں اور افکار سے جو
بیداری ہوگی، خدا اس کا آپ کو اجر دے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو سرزمین سندھ میں جس طرح نفوذ حاصل
ہوا، ڈاکٹر ہالیپوتا نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں اس کا تاریخی پس منظر بتایا۔ آپ
نے کہا کہ اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ کے افکار نے برعظیم کے مسلمانوں میں
یک ہل چل پیدا کر دی تھی۔ آگے چل کر اس سے جو اثرات مرتب ہوئے انہوں نے ایک
تحریک کی شکل اختیار کی۔ یہ تحریک علماء و مجاہدین کے ذریعہ برعظیم کے گوشے گوشے
میں پھیل گئی۔

سندھ میں یہ تحریک حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبیداللہ سندھی
جیسے بزرگوں کے ذریعہ پھیلی۔ اور یہاں کے علماء اور عوام میں حضرت شاہ ولی اللہ کے
افکار کا چرچا ہوا۔ غرضکہ بقول ڈاکٹر صاحب فروری ۱۹۶۳ء میں جب محکمۂ اوقاف
کی طرف سے حیدرآباد میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کا فیصلہ ہوا تو یہاں کی علمی فضا

اس کے لئے سازگار تھی۔

اس ضمن میں جہاں تک خود ڈاکٹر بالیپوتا کا تعلق ہے، انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم سے، جو اس زمانے میں حکمت ولی اللہی کے سب سے بڑے شارح اور علوم ولی اللہی پر بڑی گہری اور وسیع نظر رکھنے والے تھے اور جن کی ساری زندگی شاہ صاحب کی کتابوں کے مطالعہ اور ان پر غور و فکر کرتے گزری، شاہ صاحب کی کتابوں کو پڑھا اور ان کے مافیہ کو سمجھا۔ پھر موصوف آکسفورڈ یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ اور وہاں شاہ ولی اللہ پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا۔ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

---

راقم السطور نے سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں حاضرین سے شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا اجمالی تعارف کرایا۔ وہ وقف جس کی آمدنی سے اس اکیڈمی کا وجود ممکن ہوا؟ اس کی محترمہ واقفہ جناب بی بی صاحبہ مرحومہ و مغفورہ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ یہ وقف محترمہ نے اپنے خاوند الحاج سید عبدالرحیم شاہ صاحب کے والد بزرگوار جناب سید محمد رحیم شاہ صاحب کے نام پر قائم کیا تھا۔

اس اکیڈمی کی خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات و افکار کے مطالعہ و تحقیق اور ان کی نشر و اشاعت کے لئے مخصوص کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے میں نے کہا۔ حضرت شاہ ولی اللہ برعظیم پاک و ہند کے عظیم ترین عالم، عارف، حکیم، اور مفکر ہیں۔ اسلامی علوم کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں، جس میں ان کی بلند پایہ تصانیف نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کی پوری اسلامی دنیا میں ایک منفرد حیثیت ہے۔ وہ عالم کے ساتھ محقق بھی تھے اور محقق کے ساتھ ساتھ مجتہد بھی، منقول اور معقول دونوں علوم میں اور اس کے علاوہ وہ علوم تصوف و اشراق کے بھی امام تھے۔

خاص اس زمانے میں ہمیں شاہ صاحب سے کیا فکری و عملی رہنمائی مل سکتی ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے راقم السطور نے کہا۔ شاہ صاحب قدیم کو ساتھ لے کر جدید راستوں پر

چلنے کے داعی تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی طور پر یہ بھی القار ہوا تھا کہ تمہارے متعلق اللہ تعالے کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کرے۔ چنانچہ آج ہماری ملت کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے۔

مزید برآں شاہ صاحب نے نہ تو گزشتہ ملی تاریخ کا انکار کیا اور نہ اسلام کو صرف ایک مکتب فکر تک محدود کر دیا۔ انہوں نے اپنے فکر کے دروازے مستقبل کے لئے بھی کھلے رکھے اور ماضی کے سلسلے کو بھی برقرار رکھا۔ مستقبل کے لا محدود امکانات کو اپنانے کا رجحان پیدا کیا۔ آج پوری ملت کو بالعموم اور پاکستان جیسی مملکت کو بالخصوص اس طرح کی مذہبی و فکری یگانگت کی جتنی شدید ضرورت ہے اس کا ہر ہوش مند مسلمان کو احساس ہے۔

یہ بتانے کے بعد راقم السطور نے عرض کیا کہ اس معاملے میں فکر ولی اللہی ہماری سب سے زیادہ رہنمائی کر سکتا ہے اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی اس ضرورت کو پورا کرنے میں کوشاں ہے۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی۔ اور گزشتہ پانچ سالوں میں اس نے جو کام کیا ہے، مختصراً اسے بیان کیا گیا۔ اس سلسلے میں راقم السطور نے کہا۔

خوشی کی بات ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفہ اور افکار کی اشاعت سے ملک میں یہ اثر پیدا ہو رہا ہے کہ پاکستان کے مختلف مذہبی فرقوں کے باشعور طبقے اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہاں اسلامی عقائد اور اصول و مبادی کی ایک ایسی عمومی وحدت ہونی چاہیئے، جو تمام فرقوں کے مسلمانوں کو اپنے اندر لے سکے۔ اور وہ مختلف فرقوں میں رہتے ہوئے جن کی اپنی جگہ ایک تاریخی حیثیت ہے، اسلام کی بڑی وحدت میں آسکیں اور اس طرح وہ سب ایک ہو کر اس مملکت اور اس کے عوام کی ترقی و سربلندی

کوشاں ہوں۔

اس مختصر سی مدت میں اکیڈمی کو بحیثیت ایک علمی و تحقیقی ادارہ کے دور و نزدیک تسلیم کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، ہالینڈ کے ایک مستشرق ڈاکٹر ایم ایم ایس بالجن اکیڈمی میں آئے اور انہوں نے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی بعض بنیادی کتابیں ڈاکٹر بلوچ اور اکیڈمی کے دوسرے ارکان سے پڑھیں۔ ڈاکٹر بالجن شاہ ولی اللہ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں اسی طرح جامعہ سندھ کے دو طالب علم اپنے پی ایچ ڈی کے مقالات کی تیاری میں مستقل طور پر اکیڈمی کی لائبریری اور اس کے ارکان سے استفادہ کر رہے ہیں

---

سیمینار کے سات دنوں کے اجلاسوں میں دانشور حضرات کے علاوہ ایک کافی تعداد میں سندھ یونیورسٹی اور دوسرے مقامی کالجوں کے اساتذہ اور طالب علم برابر شریک ہوتے رہے۔ نیز علماء اور خطباء نے بھی اچھی خاصی تعداد میں سیمینار میں شرکت فرمائی۔ اور اس کے مباحث میں دلچسپی لی۔ ناظم اعلیٰ محکمہ اوقاف جناب محمد مسعود صاحب نے سیمینار میں ان حضرات کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے بالکل بجا فرمایا کہ ان میں استاد ہونے کی حیثیت سے بعض کا تعلق مستقبل کی نسل یعنی طلبہ سے ہے۔ اور بعض کا عالم اور خطیب ہونے کی حیثیت سے براہ راست عوام سے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ضرورت ان دونوں طبقوں (عوام اور طلبہ) میں صحیح اسلامی فکر کو بیدار کرنے کی ہے۔

اگر ہمارے عوام بیدار ہوں گے تو ملک ترقی کرے گا۔ اور ہمارے بہت سے قومی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اسی طرح جب ہمارے طلبہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسی شخصیت کے انقلابی افکار سے روشناس ہوں گے۔ تو ملک اور قوم کا مستقبل اصلاح پذیر ہوگا۔"

اس میں شک نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی شخصیت بڑی جامع حیثیات ہے اور ان کے بعد ان کے ماننے والوں میں سے ہر گروہ نے ان کی اس عظیم شخصیت کی

کسی نہ کسی حیثیت کو خاص طور سے اپنایا۔ اور حضرت شاہ صاحب کی دوسری حیثیتوں کو چھوڑ کر خاص اس حیثیت پر بہت زیادہ زور دیا۔ اس سیمینار سے مقصود اصلی یہ تھا کہ شاہ صاحب کی تعلیمات کے وہ پہلو جن کا تعلق خاص طور پر عوام کی فلاح و بہبود سے ہے۔ ان کو اجاگر کر کے عوام کے سامنے لایا جائے۔ حضرت شاہ صاحب وہ عظیم اسلامی مفکر ہیں جنہوں نے انسانی مساوات اور عدل اجتماعی پر بہت زیادہ زور دیا۔ چنانچہ سیمینار کے ہال میں شاہ صاحب کا یہ قول بڑا نمایاں لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔

اکتسبوا قدر ما یکفیکم ولا تکونوا کلاً علی الناس

(تم خود اپنے ہاتھ سے کماؤ اور لوگوں پر بوجھ نہ بنو

نیز شاہ صاحب کا یہ قول بھی۔

انما المرضی لکم الکسب بایدیکم

(بلاشبہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ تم خود اپنے ہاتھ سے کماؤ)

# شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے اقتصادی پہلو

ڈاکٹر مرزا امجد علی بیگ استاذ شعبۂ اقتصادیات سندھ یونیورسٹی

حضرت شاہ ولی اللہ اسلام کے ایک بلند پایہ مفکر، اسلامی فلسفۂ حیات کے جلیل القدر مفسر، انقلاب انگیز سیاسی و اقتصادی نظریات کے بانی اور معاشی و معاشرتی اصلاحات کے لئے اٹھارویں صدی میں فروغ پانے والی چند موثر اور ہمہ گیر تحریکوں کے روح رواں کی حیثیت سے عالم اسلام میں عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کی تعلیمات کا دائرہ بیحد وسیع ہے۔ اس سیمینار میں کئی اور دانشوران کی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کریں گے اقتصادیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے راقم نے اس مختصر مقالے میں فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے چند نمایاں اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

اس مقالے میں اس امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ شاہ صاحب کی تصانیف میں کوئی ایک علیحدہ تصنیف اقتصادیات یا اقتصادی مسائل کے لئے مخصوص نہیں کی گئی ہے۔ نہ ہی ولی اللہی فلسفے میں اقتصادیات کو کوئی علیحدہ یا مخصوص جزو

ارادے کراس پر بحث کی گئی ہے، لیکن انسانی زندگی میں اقتصادی مسائل کی اہمیت کے پیشِ نظر شاہ صاحب کی متعدد تصانیف میں ان اہم امور پر بصیرت افروز اشارے اور اکثر مقامات پر تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ جن سے اقتصادی اصولوں کی ترتیب وتہذیب کے لئے بیش قیمت مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص حجتہ اللہ البالغہ میں کئی مقامات پر تو شاہ صاحب نے اقتصادی عدم توازن کو تمدنی زندگی کی تباہی اور بدحالی کا سب سے بڑا سبب بتایا ہے۔ اور معاشرے کی اقتصادی اصلاح کو مذہبی اور روحانی ترقی کی بنیادی شرط اور انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کا اہم جزو قرار دیا ہے۔ مروجہ اقتصادی نظام اور اسلام کے اقتصادی نظام کے فرق کو واضح کرنے کے بعد اس مقالے میں شاہ صاحب کی تعلیمات کے سیاسی واقتصادی پس منظر کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ تاریخی شواہد بالخصوص ایران وروما کی عظیم الشان سلطنتوں کے عروج وزوال کی مثالیں پیش کرکے شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے بادشاہ، امرا اور اٹھارویں صدی کے انحطاط پذیر معاشرے کے افراد کو عبرت دلانے کی جو کوشش کی ہے اس کا مختصر بیان بھی اس مقالہ کا ایک جزو ہے۔

شاہ صاحب نے احیائے ملت کے لئے قرآنی تعلیمات کو عام فہم بنانے اور تراجم کے ذریعے قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کی جو تحریک چلائی تھی اس کی تجدید وتکمیل کے لئے چند مشورے اس مقالے کے آخر میں پیش کئے گئے ہیں۔

علم اقتصادیات کی ابتدا ۱۷۷۶ء میں ہوئی جب کہ آدم اسمتھ نے "دولت اقوام" نامی کتاب شائع کی۔ اس سے پہلے بھی اقتصادی مسائل سے دنیا دوچار ضرور تھی لیکن ان مسائل کے تجزیئے کی بناء پر علم وفن کا ایک مربوط نظام مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ ہرچند کہ فنی حیثیت سے اقتصادیات کے کلیوں اور اصولوں میں اب بھی وہ قطعیت اور درستگی نہیں جو طبیعی علوم مثلاً کیمیا، ریاضی۔ یا طبیعیات کا خاصہ ہیں۔ لیکن گذشتہ دو صدیوں میں بالخصوص صنعتی انقلاب کے بعد

علم اقتصادیات نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ مشرق و مغرب میں قومی اور بین الاقوامی منصوبہ بندی کے لئے اس کے وضع کردہ اصولوں کا علم بے حد ضروری تصور کیا جاتا ہے۔

زراعت، صنعت و حرفت، درآمدات، و برآمدات، تعلیم و مواصلات غرض کون سا شعبۂ زندگی ایسا ہے جو علم اقتصادیات سے کسب فیض نہ کرتا ہو اور منصوبہ بندی کے لئے اقتصادی مشیر سے رجوع نہ کرتا ہو۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اسلام کی اساسی کتاب یعنی قرآن حکیم میں اقتصادیات کا علیحدہ ایک باب ہے۔ اور نہ ہی ولی اللہی فلسفے میں اقتصادیات کو کوئی علیحدہ جزو قرار دے کر بحث کی گئی ہے، لیکن چونکہ انسانی زندگی میں اقتصادی مسائل کو بہر کیف ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ لہٰذا اس پہلو پر بھی قرآن حکیم کی تعلیمات محیط ہیں۔ اور شاہ صاحب نے بھی اپنی متعدد تصانیف میں انسان کی انفرادی، اجتماعی، اور تمدنی زندگی کی اصلاح کے لئے علم و عرفان کے جو موتی بکھیرے ہیں، ان میں اقتصادی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور چند نکات اتنے واضح طور پر بیان کئے ہیں کہ اسلام کے اقتصادی نظام کی ماہیت کے افہام و تفہیم کے لئے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور مستند تصنیف یا تفسیر پیش کی جا سکے بالخصوص آپ کی معرکتہ الآرا تصنیف حجتہ اللہ البالغہ میں ابتغائے رزق اور ارتفاقات کے مباحث میں جو بصیرت افروز اشارے موجود ہیں، ان سے اقتصادی اصولوں کی ترتیب و تہذیب میں حسب توفیق ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔

مروجہ علم اقتصادیات، جو مغربی تمدن کا ساختہ پرداختہ اور سرمایہ داری نظام کا جزوی عکس ہے، بالعموم ان وسائل و عوامل کی تحصیل و صرف پر بحث کرتا ہے جو نسبتاً کم یاب ہوں اور جو انسان کی گوناگوں انفرادی و اجتماعی احتیاجات کی تشفی کے لئے کارآمد ہوں۔ ان مباحث میں آمدنی اور مصارف

پر تو نظریاتی اور تجرباتی دلائل ضرور پیش کئے جاتے ہیں اور کم خرچ بالانشیں کے اصول پر ہمیشہ نظر رہتی ہے۔ لیکن ان مباحث میں ایک بے حد ضروری پہلو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے وسائل و عوامل کی حلت و حرمت کی بحث۔ ایک زمانے تک ماہرینِ اقتصادیات میں یہ بحث ہوتی رہی ہے اور اب بھی چند مفکرینِ اقتصادیات اپنی اس رائے پر بضد ہیں کہ اقتصادیات کو اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں[۱]

ان کا نقطۂ نظر اجمالی طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ چونکہ اقتصادیات کو ایک فن تصور کرتے ہیں اور فنی اعتبار اور خالص فنی نقطۂ نظر سے ریاضی، کیمیا اور دیگر فنون جائز و ناجائز حرام و حلال کی بحث میں الجھے بغیر مادہ کا تجزیہ کرتے ہیں اور تجربوں سے حاصل شدہ نتائج کو معروضی، غیر جذباتی اور غیر جانبدارانہ طریقے سے پیش کر کے اسے عملی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح اقتصادیات بھی فنی اعتبار سے غیر جانبدارانہ طریقے سے وسائل و عوامل کے حصول و صرف پر بحث کرنے کا مجاز ہے، جائز و ناجائز کی اخلاقی بحث میں الجھ کر اسے اپنی فنی حیثیت نہیں کھونی چاہیئے[۲]

اسلام کے اقتصادی نظام اور مروجہ اقتصادی نظریات یا علم اقتصادیات کے مروجہ نظریات میں یہ بنیادی فرق ہے کہ موخر الذکر کسب معاش اور تشفی احتیاجات سے بحث کرتے ہیں، جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی بحث میں الجھنا عار سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام حیات میں اکل حلال کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ روز قیامت ہر شخص سے یہ سوال کیا جائے گا۔

**من این اکتسبہ وفیما انفقہ**۔ زر و مال کہاں سے حاصل کیا اور پھر کہاں خرچ کیا؟

انفرادی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرآن حکیم نے جہاں جہد و اکتساب کی ترغیب دلائی ہے اور قطعی طور پر یہ صراحت کر دی ہے کہ لیس

لِلاِنسان الاّ ما سعیٰ، وہاں سورۃ مائدۃ میں اس بات کی واضح ہدایت بھی موجود ہے کہ فکلو مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً۔ پس اللہ نے جو کچھ تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال و طیب کھاؤ۔

اسلام میں عبادات کے ساتھ ہی معاملات پر تفصیلی مباحث موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں بالعموم اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بالخصوص عدل کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات میں اس اقتصادی اصول پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب ابتغاء الرزق میں ارشاد فرماتے ہیں کہ معاشی وسائل کو ذریعہ معیشت بنانے کی شرط یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی آزادی معیشت پر اثر انداز نہ ہو کہ اس سے تمدن انسانی میں فساد پیدا ہوتا ہے۔[۱]

اسی ضمن میں یہ بھی صراحت موجود ہے کہ اگر مالی نفع ایسے طریقے پر حاصل کیا جائے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور محنت کو دخل نہ ہو جیسے قمار یا زبردستی کی رضامندی کا اس میں دخل ہو جیسے سودی کاروبار، تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داری عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اسکی وہ رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی، تو اس قسم کے تمام معاملات رضامندی کے معاملات نہیں کہلائے جاسکتے۔ اور ان کو پاک ذرائع آمدنی کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکومتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل اور خبیث ہیں۔[۲]

موجودہ نظام سرمایہ داری میں کارخانوں اور کمپنیوں کے مالکوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم مزدوری میں مزدور سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے سرمایہ و محنت کی باہمی کش مکش کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، علم اقتصادیات کے متقدمین نے تو نظریاتی طور سے اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور صنعتی انقلاب

پر تو نظریاتی اور تجرباتی دلائل ضرور پیش کئے جاتے ہیں اور کم خرچ بالانشینی کے اصول پر ہمیشہ نظر رہتی ہے۔ لیکن ان مباحث میں ایک بیحد ضروری پہلو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے وسائل وعوامل کی حلت وحرمت کی بحث۔ ایک زمانے تک ماہرینِ اقتصادیات میں یہ بحث ہوتی رہی ہے اور اب بھی چند مفکرینِ اقتصادیات اپنی اس رائے پر بضد ہیں کہ اقتصادیات کو اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں [۱]

ان کا نقطۂ نظر اجمالی طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ چونکہ اقتصادیات کو ایک فن تصور کرتے ہیں اور فنی اعتبار اور خالص فنی نقطۂ نظر سے ریاضی، کیمیا اور دیگر فنون جائز و ناجائز حرام و حلال کی بحث میں الجھے بغیر مادہ کا تجزیہ کرتے ہیں اور تجربوں سے حاصل شدہ نتائج کو معروضی، غیر جذباتی اور غیر جانبدارانہ طریقے سے پیش کر کے اسے عملی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح اقتصادیات بھی فنی اعتبار سے غیر جانبدارانہ طریقے سے وسائل وعوامل کے حصول وصرف پر بحث کرنے کا مجاز ہے، جائز و ناجائز کی اخلاقی بحث میں الجھ کر اسے اپنی فنی حیثیت نہیں کھونی چاہیئے [۲]

اسلام کے اقتصادی نظام اور مروجہ اقتصادی نظریات یا علم اقتصادیات کے مروجہ نظریات میں یہ بنیادی فرق ہے کہ موخرالذکر کسب معاش اور تشفی احتیاجات سے بحث کرتے ہیں، جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی بحث میں الجھنا عار سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام حیات میں اکل حلال حلال کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ روز قیامت ہر شخص سے یہ سوال کیا جائے گا۔

من این اکتسبہ وفیما انفقہ' - زر و مال کہاں سے حاصل کیا اور پھر کہاں خرچ کیا؟

انفرادی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرآن حکیم نے جہاں جہد واکتساب کی ترغیب دلائی ہے اور قطعی طور پر یہ صراحت کر دی ہے کہ لیس

للانسان الا ما سعیٰ، وہاں سورۃ مائدۃ میں اس بات کی واضح ہدایت بھی موجود ہے کہ فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً۔ پس اللہ نے جو کچھ تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال و طیب کھاؤ۔

اسلام میں عبادات کے ساتھ ہی معاملات پر تفصیلی مباحث موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں بالعموم اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بالخصوص عدل کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات میں اس اقتصادی اصول پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب ابتغاء الرزق میں ارشاد فرماتے ہیں کہ معاشی وسائل کو ذریعۂ معیشت بنانے کی شرط یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی آزادی معیشت پر اثر انداز نہ ہو کہ اس سے تمدن انسانی میں فساد پیدا ہوتا ہے۔[۹]

اسی ضمن میں یہ بھی صراحت موجود ہے کہ اگر مالی نفع ایسے طریقے پر حاصل کیا جائے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور محنت کو دخل ہو جیسے قمار بازی یا زبردستی کی رضامندی کا اس میں دخل ہو جیسے سودی کاروبار، تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داری عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اسکی وہ رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی، تو اس قسم کے تمام معاملات رضامندی کے معاملات نہیں کہلائے جا سکتے۔ اور ان کو پاک ذرائع آمدنی کہا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکومتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل اور خبیث ہیں۔[۱۰]

موجودہ نظام سرمایہ داری میں کارخانوں اور کمپنیوں کے مالکوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم مزدوری میں مزدور سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے سرمایہ و محنت کی باہمی کش مکش کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، علم اقتصادیات کے متقدمین نے تو نظریاتی طور سے اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور صنعتی انقلاب

کے بعد مغربی ممالک میں قصر ترقی اسی بنیاد پر قائم ہوا کہ مزدور کو صرف اتنی اجرت دی جائے کہ اس کی اشد ضروری احتیاجات کی کفالت ہو سکے[5] ورنہ ان دانشوروں کو اس کا اندیشہ تھا کہ اگر مزدور کو اس کا حق یعنی صحیح اجرت مل گئی تو سکون و اطمینان کی سانس لینے کے بعد وہ کاہلی اور غفلت برتنے گا اور کام سے جی چرانے لگے گا۔ کتے کو بھوکا رکھو تو وہ شکار اچھا کرتا ہے، مزدور کو بھوکا رکھو اجرت کم دو تو وہ مفلسی و ناداری کے عالم میں سرمایہ دار کو خوش کرنے کیلئے روبہ مزاجی اختیار کرے گا۔

بے قید و بے لگام معاشی نظام کے حامیوں نے یہ فرض کر لیا کہ روشن خیال خودغرضی اجتماعی فلاح و بہبود پر لازماً منتج ہو گی[6]۔ مارکس نے صنعتی انقلاب کے ایک سو سال بعد اور آج سے کوئی ایک صدی پہلے سرمایہ داری کے ان مذموم رجحانات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایک دوسرا فلسفۂ حیات اور ایک نیا نظام عمل پیش کیا لیکن مارکس کی کتاب "سرمایہ" (مطبوعہ ۱۸۶۷ء) اور آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" (مطبوعہ ۱۷۷۶ء) کی اشاعت سے کہیں پہلے امام الہند شاہ ولی اللہ اپنی تصانیف میں اقتصادیات کے ان اصولوں کی نشان دہی فرما چکے تھے جن کی بنیاد عدل پر قائم ہے اور جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اگر دیانتداری سے ان اصولوں کو مشعل راہ بنایا گیا ہوتا تو سرمایہ و محنت کے باہمی نزاع اور امیر و غریب اور بورژوا اور پرولتاری طبقوں کے مابین کشاکش بحرانی شکل اختیار نہ کر پاتی۔ بلکہ اسلام کے وضع کردہ اصول اقتصاد یعنی عدل کی بنا پر سرمایہ و محنت میں توازن قائم ہوتا اور کائنات انسانی کی عام فلاح و بہبود کا ایک عالمگیر نظام قائم ہو چکا ہوتا۔

شاہ صاحب اٹھارویں صدی کی ابتداء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اٹھارویں صدی ایک انقلاب آفریں اور بے حد ہنگامہ خیز صدی گزری ہے بالخصوص اس صدی کے نصف آخر میں مغربی ممالک نے صنعتی، سیاسی اور معاشرتی

انقلابات کے ذریعہ ارتقا کے مختلف منازل و مراحل طے کر کے اقصائے عالم پر اپنی برتری کا سکہ جما دیا۔ مُلکی فتوحات اور استعمار کے دیگر وسائل کو بروئے کار لاکر اپنی دولت میں اضافہ کیا اور انیسویں صدی میں مغربی ممالک کا تسلط کم وبیش ساری دنیا پر قائم ہو گیا۔ بدقسمتی سے اٹھارویں صدی کی ابتدا ہی سے مشرقی ممالک کا زوال شروع ہوا۔ شاہ صاحب کی پیدائش کے چار سال بعد اورنگ زیب کی وفات واقع ہوئی اور اس کے بعد تو مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

۱۷۰۷ء سے ۱۷۵۷ء تک یعنی نصف صدی کے عرصے میں تخت دہلی پر دس تاجدار بٹھلائے گئے۔ اور اتارے گئے۔ان میں سے صرف چار اپنی طبعی موت مرے، باقی کے سر قلم کر دیئے گئے یا قید میں ڈال کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ ان سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو جن لرزہ خیز حوادث و انقلابات سے دوچار ہونا پڑا ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی ہے سادات بارہ کا تسلط، فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بصد بیکسی قید میں مرنا، تورانی امرائے دربار کے ہاتھوں ان سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج، سکھوں کا خونیں فتنہ، نادرشاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی کی معرکۂ پانی پت میں فتح، روہیلوں کا ہندوستانی سیاست میں شریک ہونا، مغربی اقوام کا ملکی سیاست میں بتدریج داخل ہوتے جانا انگریزوں کا بنگال، بہار وغیرہ پر اقتدار اور عمل دخل۔ تقریباً یہ تمام واقعات شاہ صاحب کی زندگی میں پیش آئے۔[5]

اس دورِ انحطاط میں لوگ دین سے کم وبیش بے بہرہ ہو چکے تھے۔ اور قرآن کریم کو طاقِ نسیان کی زینت بنا دیا گیا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ فال نکالنے یا حلف اٹھانے کے لئے ہی کھولا جاتا۔ ورنہ بیش قیمت جزدانوں میں تہ کر کے احترام سے کسی نمایاں جگہ رکھ دیا جاتا۔ اس زمانہ میں خانقاہ نشین پیشہ ور

فقرا، سجادہ نشین اور نام نہاد علما نے گویا کلیسائی نظام کا چربہ ہندوستان میں اتار رکھا تھا، بادشاہ، امرا، اور بالادست حکام وہ چھوٹے جاگیردار تھے جو شاہانہ زندگی اور عیش پرستانہ رنگ رلیوں کے لئے کاشت کاروں کا خون چوستے تھے۔ یہ دونوں طبقے محنت سے ناآشنا تھے۔ ملک کی دولت میں ان سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا بلکہ بقول شاہ صاحب یہ ملک کے لئے بارگراں تھے چنانچہ باب سیاست المدنیہ کے آخر میں آپ فرماتے ہیں۔

اس زمانے میں بربادی ملک کا سبب زیادہ تر دو چیزیں ہیں۔

۱۔ خاص خاص طبقے اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کئے دھرے بغیر اپنے خاص خاص امتیاز کی بنا پر مثلاً اس لئے کہ وہ قاری یا عالم ہیں، یا ان کا تعلق شعرا یا سجادہ نشین یا فقرا کے اس حلقے سے ہے جس کو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے ملتے رہتے ہیں، یا اس قسم کی دریوزہ گری اور بھیک کا کوئی ڈھنگ نکال کر خزانہ شاہی سے رقمیں وصول کرتے ہیں اور ملکی دولت کے وسیع دامن کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مطمح نظر ملک کی کوئی خدمت نہیں بلکہ رقمیں وصول کرنا ہے اور اپنا ذریعہ معیشت فراہم کرنا انکا نصب العین ہوتا ہے۔ ان مہذب دریوزہ گروں کا ایک گروہ جاتا ہے اور دوسرا گروہ آتا ہے اس طرح باشندگان ملک کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک کے لئے بارگراں بنتے رہتے ہیں۔"

(۲) کاشت کاروں، سوداگروں اور دست کاروں پر بھاری ٹیکس مقرر کئے جاتے ہیں اور ان کے وصول کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وفادار رعایا بھی بغاوت پر اتر آتی ہے جس کے فرو کرنے کے لئے جبر و تشدد سے کام لینا پڑتا ہے اور بے انتہا فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدر ضرورت صرف کیا جائے۔ ۱۹

شاہ صاحب نے ہندوستان کے اقتصادی بحران کو ملک کی بربادی، تباہی اور بدحالی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔

بقول مولانا سید محمد میاں (مصنف علمائے ہند کا شاندار ماضی) اس مذہبی رہنما (شاہ صاحب قبلہ) کا یہ فیصلہ ہندوستان کے خاص حالات سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عالم انسانیت میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سربفلک قلعوں کو مسمار کر دیا ہے۔ اس لئے سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح مذہبی اور اخلاقی اصلاح اور روحانی کمالات کے لئے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔[۱]

شاہ صاحب نے سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اہم جزو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور و معروف تصنیف حجتہ اللہ البالغہ میں معیشت پر بالتفصیل بحث کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلفات کا مرض جس نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدم توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔

ایران و روما وغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کے دل میں القا کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج کرے کہ نہ صرف مرض ختم ہو بلکہ زہر بلا مادہ بھی فنا ہو جائے جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ پس آنحضرتؐ نے ان اسباب و وجوہ پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو و نما پا رہے تھے، پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی ممانعت فرما دی۔[۱]

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت یعنی ساتویں صدی عیسوی میں ایران و روما کی سلطنتیں عروج پر تھیں مگر بقول اقبال طاؤس و رباب کا دور تھا اور اقتصادی عدم توازن نے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب ان سلطنتوں کی تاریخی مثال سے اقتصادی خرابیوں

کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر عبرت دلانے کے لئے اپنے زمانے کے پادشاہ و امرا اور انحطاط پذیر معاشرے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم میں ارشاد ہے۔

جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گذرگئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا اور آخرت تک کو بھلادیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہوگئے اور ان میں ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے لگا اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے۔ جو بیجا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لئے عیش پسندی کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامان عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جد وجہد میں مشغول و منہمک رہنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہوسکتے۔ اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کرسکتے۔ حتیٰ کہ ان کے امرا اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب۔ اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکا یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت ہو۔ یا ان کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض۔ سرد و گرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زیادہ نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں، اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مرادف ہے۔

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے معاشی نظام کا اصل الاصول بن گیا تھا اور کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امرا کے طبقے ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کرگیا تھا۔

اور عوام و خواص سب میں یہی جذبہ فاسد پایا جاتا اور ان کے معاشی نظام کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری ہوگئی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا۔ ناامیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی۔ اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام مصائب میں گھری نظر آتی تھی۔ اس لئے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور ہر شخص کو مہیا نہ تھی البتہ اس کے لئے بادشاہ نواب، امراء و حکام نے معاشی دستبرد شروع کردی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشت کاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کارپردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کرکے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں۔ اور کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی احتیاجات و ضروریات کے مطابق کچھ پیدا کرسکیں۔ خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہوگئی تھی۔

اس پریشانی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتہ بندگی جوڑنے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا۔ اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی مصاحبت، چرب زبانی اور درباری داری کو ذریعہ معاش بنانے پر مجبور ہوگئی تھی اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشو نما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست و ارذل زندگی پر قانع کردیا تھا۔ جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کرلی اور مرض ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا۔ اور اس کی غیرت نے تقاضہ کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہوجائے۔ اس نے ایک نبی امیؐ کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا۔ وہ آیا اور اس نے روم اور فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کردیا۔ اور عجم اور روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام و جمہور پر معاشی دستبرد کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیات دنیوی میں انہماک کا باعث ہوتے ہیں مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال اور تمام انسانی نفوس کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالی شان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ کی یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں۔ بہرحال خدائے تعالٰی نے اس ہستی کو اخلاق کریمانہ اور نیک ہادی کے لئے معیار اور طاہر اور پاک امور کے لئے میزان بنا دیا ہے [۱۲]

ارتفاقات پر طویل بحث کے آخر میں شاہ صاحب نے ایک بے حد اہم نکتہ کی وضاحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ صحیح معاشی نظام کا معیار یہ ہے کہ دولت و ثروت نظام معیشت میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط تفریط سے پاک ہو۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

" یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشا اگرچہ بالذات عبادت الٰہی سے متعلق ہے مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے اسی لئے پیغمبر خدا ؐ کا ارشاد مبارک ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں۔) اور اسی لئے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں رہبانیت کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی۔ بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی۔ اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے

سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو۔

پس اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں ایک یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک محبوب و محمود شے ہے اس لئے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا اور اس سے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو اس لئے کہ یکسانہ اور مجبورانہ افلاس، سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے دوسرے یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے جب کہ وہ باہمی مناقشات اور بغض وحسد کا سبب بنتی ہے اور خود اہل دولت و ثروت کے اطمینان قلب کو تعصب اور حریصانہ کدو کاوش کے زہر سے مسموم کرتی اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لئے آمادہ کرتی ہو کیونکہ اس صورت میں یہ بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت امدیا دالہٰی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے لہٰذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت نظام معیشت میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔[۱۳]

حجۃ اللہ البالغہ کے باب اقامتہ الارتفاقات و اصلاح الرسوم سے یہ طویل اقتباس اس لئے پیش کیا گیا کہ شاہ صاحب کی تعلیمات کے اقتصادی اصول اور ہمارے معاشرے کے لئے ان کی اہمیت واضح ہو جائے انہوں نے جن اصولوں کی نشان دہی کی ہے وہ رہتی دنیا تک ہر عقل سلیم کو صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لئے مشعل راہ کا کام دیں گے۔ شاہ صاحب کی تعلیمات کے تانے بانے تاریخی اعتبار سے اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی

اور سماجی پس منظر میں ہندوستان میں تیار ہوئے۔ ان کے ارشادات میں مشینوں اور مشینی دور کے مسائل کا تذکرہ نہیں ہے لیکن جاگیردارانہ نظام کے جملہ عیوب و نقائص کی نشان دہی کرنے کے بعد انہوں نے احیائے ملت کے لئے قرآنی تعلیمات کا سہارا لیا اور تراجم کے ذریعے قرآنی تعلیم کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ۲۸ سال کی عمر میں سرزمین حجاز کا سفر کیا اور وہاں یورپ اور ایشیا کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی۔ آپ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

احوال ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است۔ بلادِ عرب نیز دیدیم و احوال مردم ولایت از ثقات اینجا شنیدیم۔ [۱۲]

انہیں، ہر طرف ایک افسردگی چھائی ہوئی نظر آئی۔ ہر طرف سماجی، معاشی اقتصادی تباہیاں اپنا ڈیرہ ڈالے ہوئے تھیں اور ملت پر ایک جمود اور بے حسی کی کیفیت طاری تھی۔ بقول اقبال

بت خانہ و حرم ہمہ افسردہ آتشے   پیرِ مغاں شرابِ ہوا خوردہ در سبو

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب   عالم تمام مردۂ بے ذوقِ جستجو

انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس جمود کو توڑ دیں گے بلکہ اس فرسودہ نظام کو یکسر مٹا دیں گے۔ زیارت مدینۃ الرسول کے دوران ہی آپ پر مکاشفہ ہوا چنانچہ فیوض الحرمین میں آپ فرماتے ہیں کہ مجھ پر نیند کی ایک کیفیت طاری ہوئی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نظام عالم میں خدا کی مشیت کو پورا کرنے کے لئے امام بنا دیا گیا ہوں۔ اسی حالت میں مسلمانوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اب اللہ تعالےٰ کا کیا حکم ہے۔ "ماذا حکم اللہ فی ہذہ الساعۃ؟" میں نے جواب دیا "فک کل نظام" یعنی کسی عادلانہ نظام قائم کرنے سے پہلے سب سے اہم فرض یہ ہے کہ انقلاب پیدا کر کے موجودہ دنیا کے فرسودہ نظام ہائے حکومت

کو درہم برہم کردیا جائے۔[۱۵] اقبال بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند آں را
وز ہماں آب و گل ایجاد جہاں نو کنند

ایک جہانِ نو کی تعمیر کے لئے شاہ صاحب قبلہ نے اگر ایک طرف ملوکیت کے خلاف جہاد کے لئے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی تو ساتھ ہی تعمیری اصلاح اور ذہنی بیداری کے لئے درس و تدریس کی نئی راہیں ایجاد کیں۔

شاہ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے نزول قرآن کے اندازاً ساڑھے گیارہ سو سال بعد سرزمین ہند میں قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اسی کے بعد ترجمہ قرآن کی بنیاد پڑی، آپ ہی کے تتبع میں آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے قرآن کریم کا لفظی اردو ترجمہ کیا اور دوسرے فرزند حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے با محاورہ بزبان ہندوی قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ الغرض ترجمہ کا باب سب سے پہلے آپ ہی نے کھولا۔[۱۶]

چونکہ عوام الناس کی مادری زبان عربی نہیں تھی لہذا قرآنی تعلیمات کے دائرہ اثر کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی غرض سے شاہ صاحب نے ترجمے کی ترویج و اشاعت اور اس کی اہمیت سے امت مسلمہ کو آگاہ کیا۔ ان کے بعد ان کے نامور جانشینوں نے اس مشن کی تکمیل کی کامیاب کوشش کی۔ لیکن ختم کا ہے کو ہوا کام ابھی باقی ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ تعلیمات قرآنی کے دائرہ اثر کو توسیع دینے کی اس دور میں پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے صدیوں کی غلامی مروجہ طریقہ تعلیم اور گرد و پیش کے اثرات کے باعث ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہت سی ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جو اسلامی اصول اور قرآنی تعلیمات کے منافی ہیں مغربی تعلیم کے مضر اثرات کو زائل کرنے، صحیح لائحہ عمل کی نشان دہی کرنے اور ان نوجوانوں کی تالیف قلوب کے لئے جو اگرچہ آگ توحید کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں لیکن گرد و پیش کے اثرات سے تشکیک کا شکار ہیں یا صحیح

رہنمائی میسر نہ ہونے کے باعث صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں ایسے مراکز قائم کئے جانے کی اشد ضرورت ہے جو شاہ صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قرآنی تعلیمات کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کریں یہ مراکز با ترجمہ درس قرآن کا اہتمام کریں اور اسلامی نظام حیات کے اقتصادی سیاسی، سماجی، آئینی، مذہبی اور روحانی پہلوؤں کے متعلق مفکرین اسلام کی تعلیمات سے مستند با ترجمہ اقتباسات شائع کر کے کثیر تعداد میں ملک کے طلباء اساتذہ اور دانشوروں میں تقسیم کریں ہمارے اپنے اداروں کی جانب سے تو ہنوز کوئی ایسا انتظام نہیں اور پرائے ہماری اس غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کمی نہ پوری کی تو اپنے وسائل کے ضیاع کا یوں ہی شکوہ کریں گے کہ۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

اس مقالے میں زیادہ تر حجتہ اللہ البالغہ کے بحث الارتفاقات اور باب ابتغائے رزق سے استفادہ کیا گیا ہے۔ شاہ صاحب کی تعلیمات کے اقتصادی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرنے کے لئے ایک علیحدہ تصنیف کی ضرورت ہے۔ ان کے اسی تصنیفی شاہکار یعنی حجتہ اللہ البالغہ میں متعدد ابواب متعلق بہ زکواۃ، انفاق، میراث تدبیر منزل، بیع شراء اور سیاست مدنیہ وغیرہ میں ایسے اشارے موجود ہیں جن سے اقتصادی اصولوں کی ترتیب میں مزید مدد مل سکتی ہے۔ شاہ صاحب کا شمار اسلام کے ان عظیم مفکرین میں ہوتا ہے جنہوں نے دین فطرت کے صحیح اصول واضح کئے لہٰذا ان کی دیگر تصانیف سے کسب فیض کر کے اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک مکمل خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی یا معاشی نظام پر جو تصانیف موجود ہیں۔ انہوں نے بیشتر شاہ صاحب کی تعلیمات کو بطور سند پیش کیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ شاہ صاحب کی اپنی تصانیف پر مبنی ایک علیحدہ مبسوط اور مکمل خاکہ مرتب کیا جائے تاکہ موجودہ نظامہائے

اقتصادی اور اسلام کے اقتصادی نظام کا فرق بھی واضح ہو سکے اور شاہ صاحب قبلہ کی تعلیمات کا دائرہ اثر بھی دیع تر ہو جائے۔

---

Economic Science an Researchedissen 1 ssions American Economic Review (1) Vol. XX IV H-225 238 2 Lionel Robbins Essays on the nature + Significance of Economic

۳ حجۃ اللہ البالغہ مولفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مترجمہ علامہ ابو محمد عبدالحق حقانی، ناشرین نور محمد اصح المطابع و کارخانہ کتب کراچی جلد دوم ص۳۰۹

۴ ایضاً ص۳۱۰

Maurice Dobb Wages, Nisbet & Co. 5 London. 1957 P. 37

A C Pigou Economics of Welfare Macmillan & Co 6

۷ علمائے ہند کا شاندار ماضی مصنفہ مولانا سید محمد میاں مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی ۱۹۵۷ء جلد دوم ص۳

۸ حجۃ اللہ البالغہ مقدمہ جلد اول ص۳

۹ ایضاً جلد اول ص۹۲

۱۰ علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم ص۱

۱۱ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص۲۲۴

۱۲ ایضاً جلد اول ص۲۲۵

۱۳ " " ص۲۲۶

۱۴ کتاب التمہید فی ائمۃ التجدید بحوالہ شاندار ماضی ص۶

۱۵ اسلام کا اقتصادی نظام مصنفہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۷ء ص۳۹۳

۱۶؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول مقدمہ ص۳

۱۷؎ ایضاً جلد دوم ص ۵۷-۳۱۷

۱۸؎ اسلام کا اقتصادی نظام مصنفہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔
اسلام کا معاشیاتی نظام مصنفہ حیدر زمان کتاب منزل لاہور ۱۹۴۹ء

---

# شاہ ولی اللہ کے معاشی ارتقا کے فلسفہ پر

## ایک تقابلی و تعارفی نوٹ

مولانا الٰہی بخش جار اللہ ایم اے

انسانی زندگی کا ارتقا ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک زمانہ تھا جب دنیا نہ صرف مادی ترقیوں سے ناواقف تھی بلکہ معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور روحانی، ان بلند تر اقدار سے بھی بے بہرہ تھی جن کا درس سید الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ اسلام کے ابدی اصولوں نے زندگی کو ترقی کی ناقابل تسخیر قوتیں بخشیں جو زندگی کے کسی بھی زاویہ میں ٹھہراؤ stagnation کے تصور سے ناآشنا تھیں۔ اسلامی اصولوں کی برکت سے دنیا نے اخوت رواداری کی روایتی عدل و مساوات کی بنیادیں، تمدن و تہذیب کی قدریں، معیشت و معاشرت کی تنظیمیں پائیں۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے عرب کے ریگزاروں میں خلا بت و انتشار کی مہارتوں، علم و ہنر کی روشنیوں، فکر و نظر کی جولانیوں، صنعت و حرفت کی نیرنگیوں، عیش و نشاط کی فراوانیوں کا تصور اور شعور پیدا کیا۔ انسانی اس شعور کو لے کر انسانیت کا قافلہ زندگی کی ارتقائی جدوجہد میں رواں دواں رہا اور برابر ارتقا کی بلند تر منزلیں طے کرتا رہا مگر مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے ساتھ اس فکر کی مرکزی اہمیت نہ رہی۔ آج پھر ضرورت ہے کہ اس

فکر کا از سر نو احیاء کیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمتہ نے اسلامی نقطۂ نگاہ سے نوع انسان کے معاشی و معاشرتی ارادات کے ارتقاء کے اسباب و علل پر سیر حاصل بحث کی ہے، اس باب میں شاہ صاحب کو اسلامی و غیر اسلامی جدید مفکرین پر کتنی وجوہ سے برتری حاصل ہے، اختصار کے پیش نظر اس وقت شاہ صاحب کی فکری خصوصیات کا دور جدید کے چند چیدہ چیدہ عالمی مفکرین کے رشحات فکر سے مقابلہ کر کے اس کی جامعیت اور افادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اگر نوع انسانی کی عالمی ارتقائی معاشی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے دوران دنیا نے مادی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی ہے صنعتی انقلاب، فنی و تکنیکی ارتقاء کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے معاشی شعبوں کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی بے پناہ تبدیلیاں ہوئیں۔ انسانی زندگی اس کے گرد برق رفتاری سے جولانی کرنے لگی۔ حرکت کی اس تیزی اور ترقی کی اس جولانی نے وقت کے مفکرین کو ارتقاء کے عوامل کا کھوج لگانے کی طرف متوجہ کر دیا۔۔۔۔۔ یہ ارتقاء اگرچہ اپنی اپنی جگہ مختلف بھی ہیں اور منتشر بھی، لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک کام کر رہی ہے۔ اس قدر مشترک کو واضح کرنے کے لئے ذیل میں چند مفکرین کے زاویہ فکر کا اجمالی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے عظیم مفکر پروفیسر آدم سمتھ نے اپنی کتاب "دولت اقوام" میں ارتقاء کا واحد عامل انسان کے استحصالی منفعت کے رجحان کو قرار دیا ہے، موصوف اسے اپنے خاص انداز میں غیبی ہاتھ کا بھی نام دیتے ہیں۔ اور انھوں نے وقت کی حکومتوں کو عدم مداخلت کی پالیسی کی بھی اسی بنیاد پر تلقین کی کہ یہ غیبی ہاتھ خود بخود معیشت کو ترقی کی راہوں پر توازن کے ساتھ گامزن اور متحرک رکھے گا۔ نہ اس میں انحطاط کا خطرہ ہے نہ ہی ٹھہراؤ کا۔ حتیٰ کہ موجودہ صدی کے تیسرے دہے میں رونما ہونے والے معاشی عظیم بحران کی وجہ بھی پروفیسر پیگو Pigue نے حکومت اور ٹریڈ یونینوں

Trade unions کی مداخلت کو قرار دیا جو ذاتی منفعت کے عامل کو صحیح کام نہیں کرنے دیتیں۔

بایں ہمہ آدم سمتھ اور کلاسیکی فکر کے ابتدائی حامیان ریکارڈو اور مالتھس کو شدید مایوسی نے آ لیا کہ معیشت میں پس روی نہیں تو اچانک ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور نظریہ جب کہ مالتھس کے بعد اب تک تمام معاشی مفکرین مسلسل ارتقار Growth Steady کے تصور کے سلسلہ میں تمام تر فکری کوششیں صرف کرنے کے باوجود اس کے لئے کوئی فکری جواز اور بنیاد پیش نہ کر سکے۔ ویزلی کین یونیورسٹی کے ماہر اور معاور ڈیولپمنٹ کے پروفیسر رابرٹ ویوٹن اپنی کتاب آن ایکسپ ڈیولپمنٹ میں معاشی ارتقار کے فکری رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے معترف ہیں کہ۔

"یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ریکارڈو، مارکس، شمپیٹر، ہیرڈ، ڈومر تمام کے دلائل اس بات پر زور دیتے ہیں کہ موجودہ معیشت اچانک ٹھہراؤ کی کیفیت اختیار کر لے گی۔"

ریکارڈو اور مالتھس نے یہاں تک بھی پیشگوئی کی کہ وقت کی عظیم فنی ایجادات اور ٹیکنیکی امکانات کے باوجود ملک کی اکثریت جو محنت کش طبقہ پر مشتمل ہے آہنی قانون کے تحت قوت لایموت Bare Subsistancy سے زیادہ حاصل نہیں کر سکے گی۔

فی الحقیقت فکری یہی زاویہ تھا جس نے کارل مارکس اور اس کے پیروکاروں کو اس فکری بغاوت پر مجبور کیا کہ انسانی زندگی کو ترقی کی راہ میں یہ آہنی دیوار محنت کی رسد نے نہیں بلکہ سرمایہ دار کی بنا پر روک ٹوک، لوٹ کھسوٹ نے کھڑی کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جب اشیاء میں تخلیق یا تخفیف قدر کا عمل محنت ہی کا مرہون منت ہے تو اس عمل سے حاصل ہونے والی فاضل قدر Surplus Value کا بھی محنت کے علاوہ کوئی حقدار نہیں جس پر سرمایہ دار نے ناجائز حق جتا کر معیشت کو ترقی کرنے سے روک دیا ہے۔

ارتقائی فکر کا یہ معاشی تجزیہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک تاریخی تجزیہ بھی پیش کیا گیا۔ جس کا اولین نقیب خود کارل مارکس تھا۔ کارل مارکس نے معاشرتی و معاشی ارتقاء کی بنیاد امدادی مادیت Dialectical Materialism کے

تاریخی تصور پر رکھی۔ ہر چند مارکس کا یہ تصور ہیگل کی اضدادی منطق پر موقوف تھا تاہم مارکس کو اس کا بھی دعویٰ تھا کہ طبقاتی ارتقار کا یہ نظریہ سائنٹیفک ہے کیونکہ یہ نظریہ ڈارون کے نظریہ تنازع للبقار Struggle for Existance اور بقائے اصلح Survival the Fittest کی طرح علمی مشاہدات اور استخراجی استدلالات پر مبنی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ کارل مارکس نے استخراجی اور استقرائی انداز پر مقدمات کی بنیاد پر جتنی پیشگوئیاں کیں ان میں سے کوئی بھی پوری نہ ہوسکی۔ یہ چیز بجائے خود اشتراکی مادیت کے تصور کے سائنٹیفک نہ ہونے کا واضح ثبوت ہو۔

ہسٹاریکل سکول کے جرمن ماہر معاشیات برونو ہلڈبراند اور کارل بوخر نے بھی معاشی ارتقار کی بنیاد خود غرضانہ مقاصد و جذبات پر رکھی ہے۔ اور ابتدائی وحشت و بربریت، انفرادیت پسندی اور اجتماعیت گریزی کو ارتقار کی اصل قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک چونکہ خود غرضانہ مقاصد کا حصول معاشرتی تعاون کے بغیر ناممکن تھا اس لئے اضطراری طور پر عمرانی معاہدات وضع کئے گئے۔ جس سے گھریلو، قصباتی اور قومی نظام وجود میں آئے۔

فریڈرک لسٹ کا شمار ان معاشی مصلحین کی فہرست میں ہوتا ہے جنہوں نے یہ آواز بلند کی کہ

"معاشرہ کو متحارب افراد کے مختلف گروہوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ترکیبی کل ہونا چاہئیے"۔

فریڈرک لسٹ، میولر اور مورس کی طرح مزدوروں میں یہ احساس پیدا کرنے کا بھی حامی تھا کہ وہ ایک کل کے اجزار ہیں، لیکن اس کے لئے وہ فکری اور عملی کوئی بنیاد پیش نہ کرسکا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام آرار و افکار حالات و ظروف کی وقتی تعبیرات کے سوا کچھ نہیں۔ جنہیں نہ تو علمی اور سائنسی کمال کا نام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی فلسفیانہ حیثیت کا، بلکہ اگر ان مخصوص احوال و ظروف سے نظر ہٹا کر جائے جن کی تشریح اور تعبیر کے لئے یہ خیالات گوشہ میں گئے ہیں تو ان کی کوئی قیمت بھی نہیں رہتی۔

ان تمام کے پیچھے صرف ایک سانحہ کام کر رہا ہے اور وہی قدر مشترک بھی ہے اور وہ ہے مغربی استعمار میں مظلوم اور ظالم کی کشاکش! جسے کارل مارکس نے منشور میں تاریخی حقیقت

کا عنوان دے کر یوں پیش کرتا ہے۔

"تا ہنوز جس قدر معاشرتیں وجود پذیر ہوئی ہیں سب کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے، آزاد اور غلام، امیر اور غریب، آقا اور رعیت، آجر اور اجیر بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم مسلسل باہم دگر برسر پیکار رہے۔ ایک مسلسل اور لاانتہائی جنگ۔ ایک جنگ جو ہمیشہ یا تو معاشرت کی انقلابی تشکیل نو پر اور یا پھر فریقین کی تباہی پر منتج ہوئی ہے۔"

مارکس آگے چل کر لکھتا ہے۔

"اور موجودہ بورژوا معاشرت نے بھی۔ جو جاگیردارانہ معاشرت کے کھنڈرات پر اٹھی ہے۔ اس کش مکش کو ختم نہیں کیا ہے۔ بلکہ قدیم طبقاتی آویزش کے بجائے ظلم وستم کے نئے انداز کے ساتھ نئی طبقاتی جنگ کو جنم دیا ہے۔ اور قدیم معاشرتی تقسیم در تقسیم کی جگہ معاشرت کو دو متحارب گروہوں یعنی بورژا اور پرولتاری میں بانٹ دیا ہے۔"

یہ ہیں وہ حالات جن کی تعبیر و تشریح اور ترجمانی ڈارون تنازع للبقاء اور ارتقاء اصلح

کے عنوان سے کرتا ہے تو ھیگل فکری جدلیت کی منطقی تعبیر سے، کارل مارکس اضدادی مادیت کے تاریخی تصور سے کرتا ہے تو آدم سمتھ ذاتی منفعت کی حرص و آز سے اور میں یہاں تک عرض کرنے کی بھی اجازت چاہوں گا کہ حالات کا یہی ہیجان ریکارڈو، مالتھس، سپنیٹر، ہولڈ، ڈومر اور ھینس کی فکری تشریح میں اچانک سیکولرسٹیکیشن کی مایوس کن کیفیت حاصل کرلیتا ہے۔ اور ڈیڑھ صدی کی مسلسل جدوجہد کے بعد معاشی ومعاشرتی ترقی کی تمام فکری راہیں بیک وقت تاریک تر اور مسدود ہو جاتی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمتہ کے فلسفہ ارتقاء کے بنیادی نقاط پیش کرنے سے پہلے ہم حضرت شاہ صاحب کی خصوصی اصطلاح ارتفاق کی تشریح کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اسے معاشی ومعاشرتی ارتقاء سے کیا تعلق ہے۔

ارتفاق کے لفظ کا مادہ رفق ہے۔ اس کا مطلب نرمی یا نرمی سے کام لینا ہے (۱)
حضرت شاہ صاحب کی یہ اصطلاح معاشرتی، مذہبی، فکری ارتقار سے بالعموم اور معاشی
ارتقار کے تصور سے بالخصوص متعلق ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ مثال کے طور پر پیدائش
دولت کا عمل لیجئے۔ پیدائش دولت کا مطلب، مادہ کو عدم سے وجود میں لانا یا اس کی
تخلیق نہیں، اور نہ ہی اس کا مفہوم اشیار کے اندر ایسے فوائد کی تودیع ہے جو خالق کائنات
نے ان میں پیدا نہیں ماسئے۔ کیونکہ اس معنی کی رو سے ایک انسان پیدائش کے عمل سے
بالکل قاصر ہے۔ دراصل پیدائش دولت کا عمل اشیار کی قدر کی تصنیف ہے، آسان سی
مثال لیجئے جیسے بڑھئی لکڑی پر وقت صرف کر کے اسے میز کی شکل دے دیتا ہے جو قدر و قیمت
میں لکڑی کے ایک ٹکڑے سے کہیں بڑھ کر ہے۔
اس مقصد کے لئے ایک انسان کو قدرتی اور طبعی شئی پر وقت خرچ کرنا پڑتا ہے، دماغی
یا جسمانی محنت صرف کرنا پڑتی ہے۔ اور آلات و سرمایہ بھی کام میں لانا پڑتا ہے تقسیم کار کے
موجودہ دور میں اگرچہ یہ تمام کام علیحدہ علیحدہ شعبوں اور حصوں میں بٹ چکے ہیں، تاہم بنیادی
طور پر یہی طریق کار ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابیوں سے ہمکنار رہا۔
اور اس کی بدولت اس نے فطرت کو رام کرنا سیکھا۔ پھر وہ اس راہ میں جوں جوں قدم آگے
بڑھاتا گیا توں توں، اس کے لئے راستہ ہموار ہوتا گیا۔ یہی ترجمان اتفاق ہے، اور یہی ارتقاء
ترجمان، اسرار ولی اللہی حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم رقمطراز ہیں۔

"اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے اوزاروں کے ذریعہ تھوڑے وقت
وقت میں کم طاقت خرچ کرنے سے بہت فائدے حاصل کرنے کو ارتفاق
صالح کہا جاتا ہے" (۲)

حضرت مولانا غلام حسین صاحب جلبانی اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" میں
ارتفاق کی تشریح کے تحت ارشاد فرماتے ہیں۔

کائنات کی وہ تمام اشیار جو انسان کے لئے فائدہ بخش ہیں وہ خود بخود
انسان کے تصرف میں نہیں آتیں ...... تصرف استفادہ کیلئے یہ اشیار

انسان کو اپنی سہولت اور فائدہ کے مطابق تیار کرنا پڑتی ہیں۔" (۳)

ارتفاق کے اسی عنوان کے تحت حضرت شاہ صاحب نے معاشی و معاشرتی ارتقاء کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ دیگر تمام ارتقائی فلسفوں میں تاریخی اعتبار سے مدلل، فکری اعتبار سے مکمل، عقلی اعتبار سے موثق، روحانی اعتبار سے موید، فلسفیانہ اعتبار سے عالمگیر اور اصولی اعتبار سے فطری ہے۔ اس تشریح کے بعد امید ہے کہ شاہ صاحب کے فلسفہ کی بنیادی خصوصیات بہتر طریق سے ذہن نشین ہو سکیں گی۔

ذیل میں شاہ صاحب کے فلسفہ کی رو سے انسان کے معاشی و معاشرتی ادارات کے ارتقاء کے مندرجہ ذیل بنیادی عوامل کا اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) ارتقاء کا معاشی محرک

(۲) ارتقاء کا انسانی عامل

(۳) ارتقاء کا وجدانی ذوقی و نفسیاتی عامل

(۴) ارتقاء کا تجربی استقرائی و ٹیکنیکی عامل

(۵) ارتقاء کا جبلت، عقل اور قلب انسانی کی معرفت الہامی، باطنی، توالی عامل

(۶) ارتقاء کا تاریخی عامل

(۷) عمرانی ارتقاء کا عامل۔

۱۔ شاہ صاحب بنیادی طور پر ان لوگوں کے خلاف ہیں جو ابتدائی انسان کو وحشت کا خوگر، ہم نوع دیگر افراد انسانی سے متنفر اور اس سے برسر پیکار بتاتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک اجتماعیت، معاشرت، مدنیت انسان کی فطرت ہے، الفت و مروت اس اس کی طبیعت ہے اور تعاون و مواسات اس کی سرشت میں داخل ہے (۲) اس لئے اس کے معاشرتی و معاشی ارتقاء کے اسباب داخلی اور طبعی ہیں، وضعی اور اضطراری نہیں۔

شاہ صاحب دیگر تمام مفکرین کی طرح انسانی خواہشات اور ان کی تسکین کے جذبہ کو معاشی محرک قرار دیتے ہیں۔ (۵) لیکن آپ کے نزدیک انسانی معیشت اور معاشرت کا ارتقاء اس کی

تین دیگر خصوصیات پر مبنی ہے۔ ان میں سے پہلی انسانی خصوصیات ہے۔ دوسری نفسیاتی اور وجدانی اور تیسری معاشرتی و عمرانی و ٹیکنیکی خصوصیت ہے۔ ان کے پیچھے اصل محرک معاشی خواہشات ہیں۔ وہ تین خواہشات یہ ہیں۔

پہلی خصوصیت انسان میں طبعی محرک کے علاوہ ایک عقلی محرک یا منشاء کلی کا ہونا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک حیوان ہیئت جبلی کے تحت عمل کرتا ہے لیکن انسانی اعمال کے پیچھے اس کا طبعی اور جبلی خواہش یا داعیہ کام نہیں کر رہا ہوتا بلکہ ایک عقلی مقصد اس کا اصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے بنی نوع میں بہتر اخلاق کا طالب ہونا ہے کے لئے کوشاں ہونا یا ملک میں صالح نظام و معاشرت و معیشت کیلئے جد و جہد کرنا۔ یہ سب طبعیت و جبلت سے بلند تر عقلی و کلی تقاضے ہیں (۶) گویا انسان میں، مغرب کے موجدین کو چھوڑ کر بنی نوع انسانی سے ہمدردی، اس کی موجودہ فلاح بہبود اور اس کی ترقی و خوشحالی کا جذبہ پنہاں ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہی جذبہ ہے جو ترقی کیلئے مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔

۲۔ انسان کی دوسری خصوصیات وجدانی اور ذوقی ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ انسان اپنی خواہشات کی تسکین حیوانوں کی طرح نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے ایک ایسا ماحول تیار کرتا ہے جو اس کے ذوقِ سلیم اور وجدان و مذاق کا آئینہ دار ہو (۷) مثال کے طور پر وہ کھانے کی خواہش ایک جانور کی طرح نہیں مٹاتا بلکہ کھانا کھانے کے لئے ایک طریقہ و سلیقہ، ایک ماحول تیار کرتا ہے جو اس کے ذوقِ لطافت و نظافت کو تسکین دے۔ اسی طرح وہ مشروب بھی خوشگوار چاہتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی انسان کی اس فطری خصوصیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کیونکہ اس نے جہاں انسان کے رہنے کی جگہ کا ذکر فرمایا ہے تو وہاں یوں ارشاد فرمایا ہے "وہ مساکن ترضونہا" یعنی مسکن جو اس کے ذوقِ حسن و جمال کی تکمیل کرتے ہیں" اس سے عیاں ہے کہ انسان کو صرف مسکن نہیں مسکن کے ساتھ کچھ اور بھی ذوقی داعیہ کی تکمیل بھی مطلوب ہے۔

۳۔ انسان کی تیسری خصوصیات استنباط اور تقلید کا ملکہ ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسانوں میں سے کچھ اس قدر دانشمند اور ذی شعور ہوتے ہیں جو خواہشات کے احساس مقاصد کے ادراک کے ساتھ ان کی تسکین کے لئے عمدہ اور صالح تدابیر کا استنباط کرتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں

جنہیں یہ ملکہ نصیب نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے دلوں میں مقاصد و مدعا تو پیدا ہوتے ہیں مگر وہ انکے بہترین حل کا استنباط نہیں کر پاتے۔ اول الذکر کو باری تعالیٰ نے مقاصد اور ان کی تکمیل کا تفصیلی ملکہ بخشتا ہوتا ہے اور موخر الذکر کو اجمالی اس لئے یہ لوگ جب پہلے قسم کے لوگوں کے استنباط کو معلوم کرتے ہیں تو اپنے علم اجمالی کے موافق پا کر اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں (۸) علم اجمالی کی سادہ اور سرسری مثال ایک معصوم بچے کی لیجئے جسے مثال کے طور پر پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ روتا ہے۔ اس کی ماں اس کے حلق میں پانی کے چند قطرے اتارتی ہے تو اس سے وہ سکون اور تسکین کا وجدان حاصل کرتا ہے۔ فی الحقیقت یہی ملکہ اجمالی ہے۔ جو اسے خواہش کا شعور دیتا ہے اور تسکین کا احساس لیکن پانی ملنے سے پہلے وہ اس پر قادر نہیں جو تفصیلی طور پر بتا سکے کہ اس کی پیاس کیونکر بجھے گی۔ ان میں دونوں ملکوں میں سے ملکہ اجمالی تقلید کرتا ہے تو ملکہ تفصیلی استنباط کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ارتقائی تعبیر کرنے کے فلسفیانہ پہلو بیان کرنے میں شاہ صاحب سے کوئی بھی آگے نہیں نکل سکا۔

۵۔ اسی پر بس نہیں، حضرت مجدد العلت، قطب زماں، فلاسفی دوراں، جناب شاہ صاحب نے انسان کی ان منازل ارتقاء کے سلسلہ میں ایک اور درکنون، سرنہاں اور رازدروں کا انکشاف کیا ہے جس کے بغیر تمام نظریات ارتقاء لغو اور بے بنیاد تھے۔ وہ یہ ہے کہ کارگاہ ہستی کے اس عظیم الشان نظام کے پیچھے ایک بلند تر نور اور حقیقت الحقائق معروف عدل ہے جو اس عالم کے ہر ذی حیات کو اس کی بقاء زیست کے ہر شعبہ میں اور اس کے سفر ارتقاء کے قدم پر اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔ اور اسے راہ دکھاتا ہے (۹) اس لئے حضرت شاہ صاحب کے نزدیک معیشت و معاشرت کا یہ ارتقاء محض اکتسابی، وجدانی اور عقلی ہی نہیں بلکہ تودلیعی اور وہبی بھی ہے۔ شاہ صاحب ذی حیات کے اندر باطنی اس کیفیت نور اور اس کے جلاء کو اپنی خاص اصطلاح میں "الہام" کا عنوان دیتے ہیں۔ اس بارے میں شاہ صاحب کی تفصیلات کا اجمالی تجزیہ کیا جائے تو الہام کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

اول جبلی الہام۔ الہام کی یہ قسم عام ہے۔ اس میں ہر ذی حیات شامل ہے۔ انسان ہو یا غیر انسان یہ بقاء وجود کا جبلت حیوان کی معرفت الہام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر دو قسمیں صرف انسان کے

تین دیگر خصوصیات پر مبنی ہے۔ ان میں سے پہلی انسانی خصوصیات ہے۔ دوسری نفسیاتی اور وجدانی اور تیسری معاشرتی و عمرانی و ٹیکنیکی خصوصیت ہے۔ ان کے پیچھے اصل محرک معاشی خواہشات ہیں۔ وہ تین خواہشات یہ ہیں۔

پہلی خصوصیت انسان میں طبعی محرک کے علاوہ ایک عقلی محرک یا منشاء کلی کا ہونا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک حیوان ہیئت جبلی کے تحت عمل کرتا ہے لیکن انسانی اعمال کے پیچھے اس کا طبعی اور جبلی خواہش یا داعیہ کام نہیں کر رہا ہوتا بلکہ ایک عقلی مقصد اس کا اصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے بنی نوع میں بہتر اخلاق کا طالب ہونا ہے کے لئے کوشاں ہونا یا ملک میں صالح نظام و معاشرت و معیشت کیلئے جدوجہد کرنا۔ یہ سب طبعیت و جبلت سے بلند تر عقلی و کلی تقاضے ہیں (۶) گویا انسان میں، مغرب کے موجدین کو چھوڑ کر بنی نوع انسانی سے ہمدردی، اس کی موجودہ فلاح بہبود اور اس کی ترقی و خوشحالی کا جذبہ پنہاں ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہی جذبہ ہے جو ترقی کیلئے مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔

۳۔ انسان کی دوسری خصوصیات وجدانی اور ذوقی ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ انسان اپنی خواہشات کی تسکین حیوانوں کی طرح نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے ایک ایسا ماحول تیار کرتا ہے جو اس کے ذوقِ سلیم اور وجدان و مذاق کا آئینہ دار ہو (۷) مثال کے طور پر وہ کھانے کی خواہش ایک جانور کی طرح نہیں مٹاتا بلکہ کھانا کھانے کے لئے ایک طریقہ وسلیقہ، ایک ماحول تیار کرتا ہے جو اس کے ذوقِ لطافت و نظافت کو تسکین دے۔ اسی طرح وہ مشروب بھی خوشگوار چاہتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی انسان کی اس فطری خصوصیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کیونکہ اس نے جہاں انسان کے رہنے کی جگہ کا ذکر فرمایا ہے تو وہاں یوں ارشاد فرمایا ہے "وہ مساکن ترضونہا" یعنی مسکن جو اس کے ذوقِ حسن و جمال کی تکمیل کرتے ہیں" اس سے عیاں ہے کہ انسان کو صرف مسکن نہیں مسکن کے ساتھ کچھ اور بھی ذوقی داعیہ کی تکمیل بھی مطلوب ہے۔

۴۔ انسان کی تیسری خصوصیات استنباط اور تقلید کا ملکہ ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسانوں میں سے کچھ اس قدر دانشمند اور ذی شعور ہوتے ہیں جو خواہشات کے احساس مقاصد کے ادراک کے ساتھ ان کی تسکین کے لئے عمدہ اور صالح تدابیر کا استنباط کرتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہوتے ہیں

جنہیں یہ ملکہ نصیب نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے دلوں میں مقاصد و مدعا تو پیدا ہوتے ہیں مگر وہ انکے بہترین حل کا استنباط نہیں کر پاتے۔ اوّل الذکر کو باری تعالیٰ نے مقاصد اور ان کی تکمیل کا تفصیلی ملکہ بخشتا ہوتا ہے اور موخرالذکر کو اجمالی اس لئے یہ لوگ جب پہلے قسم کے لوگوں کے استنباط کو معلوم کرتے ہیں تو اپنے علم اجمالی کے موافق پا کر اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں (۸) علم اجمالی کی سادہ اور سرسری مثال ایک معصوم بچے کی لیجئے جسے مثال کے طور پر پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ روتا ہے۔ اس کی ماں اس کے حلق میں پانی کے چند قطرے اتارتی ہے تو اس سے وہ سکون اور تسکین کا وجدان حاصل کرتا ہے۔ فی الحقیقت یہی ملکہ اجمالی ہے۔ جو اسے خواہش کا شعور دیتا ہے اور تسکین کا احساس لیکن پانی ملنے سے پہلے وہ اس پر قادر نہیں جو تفصیلی طور پر بتا سکے کہ اس کی پیاس کیونکر بجھے گی۔ ان میں دونوں ملکوں میں سے ملکہ اجمالی تقلید کرتا ہے تو ملکہ تفصیلی استنباط کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ارتقائی تعبیر کرنے کے فلسفیانہ پہلو بیان کرنے میں شاہ صاحب سے کوئی بھی آگے نہیں نکل سکا۔

۵۔ اسی پر بس نہیں، حضرت مجدد العلت، قطب زماں، فلاسفی دوران، جناب شاہ صاحب نے انسان کی ان منازل ارتقار کے سلسلہ میں ایک اور درکنون، سرنہاں اور رازدرون کا انکشاف کیا ہے جس کے بغیر تمام نظریات ارتقاء لغو اور بے بنیاد تھے۔ وہ یہ ہے کہ کارگاہ ہستی کے اس عظیم الشان نظام کے پیچھے ایک بلند تر نور اور حقیقت الحقائق معروف عدل ہے جو اس عالم کے ہر ذی حیات کو اس کی بقار زیست کے ہر شعبہ میں اور اس کے سفر ارتقاء کے قدم پر اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔ اور اسے راہ دکھاتا ہے (۹) اس لئے حضرت شاہ صاحب کے نزدیک معیشت و معاشرت کا یہ ارتقار محض اکتسابی، وجدانی اور عقلی ہی نہیں بلکہ تودلیعی اور وہبی بھی ہے۔ شاہ صاحب ذی حیات کے اندر باطنی اس کیفیت نور اور اس کے جلار کو اپنی خاص اصطلاح میں "الہام" کا عنوان دیتے ہیں۔ اس بارے میں شاہ صاحب کی تفصیلات کا اجمالی تجزیہ کیا جائے تو الہام کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

اوّل جبلی الہام۔ الہام کی یہ قسم عام ہے۔ اس میں ہر ذی حیات شامل ہے۔ انسان ہو یا غیر انسان یہ بقار وجود کا جبلت حیوان کی معرفت الہام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر دو قسمیں صرف انسان کے

ساتھ خاص ہیں۔ پھر انہیں سے ایک عقلی ہے یعنی عقل و وجدان اور ذہنی و شعور کی معرفت الہام اس میں عقلاء، حکماء، صلحاء، انبیاء، تمام شامل ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم قلبی الہام کی ہے یہ صرف انبیاء علیہم السلام کے قلوب قدسیہ پر وارد ہوتے ہیں۔ (۱۰)

اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک ارتقاء اور ارتفاق صرف نوع انسان کی خاصیت ہے۔ حیوانی جبلت نہ تو ارتفاق و ارتقاء کی متحمل ہے اور نہ ہی اس کی فطرت میں اس کی صلاحیت تودیع کی گئی ہے۔ اور بشری طبائع میں اس کی تودیع شاہ صاحب کے نزدیک کسی دلیل کی محتاج نہیں فرماتے ہیں۔

"علم الارتفاق کا بشری طباع میں نزول ایک بدیہی اور اظہر من الشمس حقیقت ہے جس کے لئے کسی برھان یا دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے چرند و پرند کے سینوں میں بقا و زلیت کے جبلی احساس کا نزول"۔

(۱۹)

۶۔ حضرت شاہ صاحب نے ارتقاء کے اس فلسفیانہ اور استخراجی طریق استدلال کو استقرائی و تاریخی شواھد سے موثق اور مدلل فرمایا ہے۔ اور تاریخی اعتبار سے اس کو چار منزلوں میں تقسیم (ارتقاء کی پہلی منزل) فرمایا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک (پہلی منزل ارتقاء) کا سراغ حضرت آدم علیہ السلام کے دور کی معیشت و معاشرت میں ملتا ہے۔ دوسری اور تیسری منزل کا سراغ سیدنا حضرت ادریس، حضرت سلیمان اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کے ادوار میں ملتا ہے (۱۱) اور اس کی آخری منزل بین الاقوامی اور عالمگیر معیشت و معاشرت کی ہے۔ (۱۲)

شاہ صاحب کی نگاہ میں انسان کا یہ معاشرتی و معاشی ارتقاء طبیعی، فطری اور داخلی، خارجی اور اضطراری یا وضعی نہیں۔ اسی لئے یہ فطرت کی طرح ہم آہنگ یکساں اور عالمگیر ہے معاشرت اور معیشت کے اس عالمگیر نظام کے تمام فکری و عملی اصول نبی امی صلی علیہ وسلم کی تعلیمات سے ملتی ہیں۔ (۱۳)

۷۔ شاہ صاحب انسانیت کے عمرانی ارتقاء کو بھی معاشی ارتقاء کا اہم عامل قرار دیتے

ہیں اور اس کی پانچ منزلیں قرار دیتے ہیں ۔

پہلی منزل :-

ایک چھوٹے معاشرے کی ہے ۔جو کوہ وصحرا میں بسنے والے چھوٹے چھوٹے اجتماعات پر مشتمل تھا ۔یہ آبادیاں ایک دوسرے سے دور واقع تھیں ، مختلف آبادیوں کا باہمی معاشی تعاون وتبادل رائج نہ تھا ۔صحرائی مختصر سی یہ آبادیاں اپنی اپنی جگہ خود کفیل معیشت کے اصولوں کے مطابق تعاون وتبادل کی سادہ اور ابتدائی شکلوں پر عمل پیرا تھیں ۔ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک کوئی اجتماع ومعاشرہ خواہ جس قدر مختصر ہی کیوں نہ ہو ارتفاق اول سے خالی نہیں ہوتا ۔(۱۴)

دوسری منزل :-

میں انسانی آبادی بڑھ گئی ۔وسائل نقل وحمل میں ترقی ہوئی ۔دور دور آبادیاں قریب تر ہو گئیں ۔تعامل وتبادل عام ہوا ۔تجارب ومشاہدات اور افکار میں ہم آہنگی پیدا ہونا شروع ہوئی ۔پہلی منزل کے معاشی ومعاشرتی طور وطریقے جو نہایت سادہ تھے اب نکھرنا شروع ہوئے ۔ان میں حسن وجمال ، ذوق ولطافت ، رائے کلی اور استنباط وتجربیت کا زیادہ خیال کیا جانے لگا ۔ارتفاق اول کے اعمال زیادہ ترقی یافتہ صورتوں میں انجام پانے لگے ۔(۱۵)

تیسری منزل :-

سیاست کی منزل ہے ۔جب منتشر آبادیوں نے سمٹ کر شہروں کا روپ دھار لیا ، صنعت وحرفت اور زراعت کو ترقی ہوئی ۔معاشی معاملات وسیع پیمانے پر رونما ہوئے (۱۶) اور جب ان ممالک اور اقوام کا باہمی میل جول ہوا ،معاشی ربط وضبط نے ایک قدم آگے بڑھایا ۔تعاون وتعامل بڑھا ، وسائل نقل وحمل نے نئی کروٹ لی تو چوتھی ، آخری اور ارتفاق کی بین الاقوامی ، بین المملکتی اور بین الملی منزل سامنے آئی ۔

گویا پہلی منزل دیہاتی معیشت کی ، دوسری منزل شہری معیشت کی ، تیسری ملکی معیشت کی اور چوتھی بین الاقوامی نظام معیشت کی ہے ۔حضرت شاہ صاحب نے آخری منزل کے بین الاقوامی ادارے ، ان کی تشکیل اور ان کی نوعیت پر بھی سیر حاصل بحث

فرمائی ہے۔ (۱۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت قائم الزماں علیہ الرحمۃ ارتقاء کو استقرائی اور تجربی بتاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ

"انسانی جمعیت استنباط تدابیر کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر ایسی شخصیتوں کی محتاج رہی ہے، جو سر چشمۂ حکمت و دانش ہوں، انسانی ضروریات سے واقف ہوں، کے طریقوں کے شناساں ہوں، اور محض مصلحت کلی کو سامنے رکھکر نتائج اخذ کرنے کے عادی ہوں" (۱۸)

لیکن مصلحت کلی اور عالمگیریت کا یہ انداز قومیت کے موجودہ مغربی جنون میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے اسلام کے عالمگیر اصول ہی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں۔ ورنہ دیگر انداز مفضی الی اجمال للعاشں ہوگا۔ (۱۹)

یہاں ایک اور پہلو کا اجمالی ذکر بھی ضروری ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے انسان کی معاشی ترقی کے لئے معاشی و معاشرتی، سیاسی اور مذہبی ادارات مثال کے طور پر ذاتی ملکیت، وراثت، انتقالی ادائیگیاں، صدقات و خیرات، نظام زر و صنعت و حرفت کے ارتقاء عالمگیر سیاسی ادارات وغیرہ پر حکیمانہ بحث فرمائی ہے۔ اور بتایا ہے ان سے معیشت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں کیا سہولتیں حاصل ہوتی ہیں یا کیا رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔

آخر میں میں اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں پیش کرنے کی جرأت کرونگا کہ اس تقابل سے مقصود موجودہ دور کے ٹیکنیکی امکانات اور فنی تکمیلات کو بے بنیاد ثابت کرنا نہیں اور نہ یہ مقصود ہے کہ ہمارے ان مفکرین کے افکار سائنس اور ٹیکنالوجی کی تفصیلات اور جزئیات و مشاھدات کا نعم البدل ہیں۔ اور ایسا ہونا ناممکن بھی ہے کیونکہ اس وقت ان جزئی مسائل کا وجود بھی نہ تھا پھر یہاں ایک بنیادی فرق بھی ہے۔ کہ ہمارے ان مفکرین کی فکری تعبیریں ابدی اور ازلی ہیں اور ابدی حقائق و معارف پر مبنی ہیں، اس کے برعکس ٹیکنیکی موجودہ تجزیئے وقت کے مسائل کا تفصیلی اور جزئی جائزہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک اس تقابل کی اہمیت اور ضرورت اس لئے شدید ہے کہ اگر ٹیکنیکی ان امکانات کا جائزہ

ہمارے زندہ جاوید اسلاف کی فکری بنیادوں پر لیا جائے ۔ اس سے قوم کی مادی ترقی اور اخلاقی ، ذہنی ، عقلی روحانی اور مذہبی اقدار میں نہ صرف ہم آہنگی پیدا ہوگی بلکہ ایک متوازن اور مسلسل ترقی کے لئے

راہیں ہموار ہوں گی جو نہ صرف قومی معاشرت و معیشت کے لئے ترقی کی شاہراہ کا کام دیں گی بلکہ عالمگیر پیغام ارتقاء و صعود ہوں گی اور فکری ان اصولوں کا سہارا لے کر عالمی معیشت و معاشرت اس سے بھی نجات حاصل کر سکے گی جس کا زبردست خطرہ موجودہ ترقی یافتہ معیشتوں کو براہ راست اور ترقی پذیر معیشتوں کو بالواسطہ درپیش ہے ۔

واقف اسرار ولی اللہی حضرت مولانا عبداللہ سندھی مرحوم اپنی کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ، میں لکھتے ہیں ۔

اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک قطعہ پر جمع کرے اور سب فکروں سے بلند فکر یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو ساری انسانیت پر جامع ہو اس کی طرف لوگوں کو بلائے ۔ اور ان سے ان پر عمل کرائے انٹرنیشنل انقلاب یہ مضمون میں نے قرآن مجید کی آیت ....

"ہو الذی ارسل رسولہ" سے استنباط کیا ہے (۲۰)

خود حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمتہ کے نزدیک اس زاویہ فکر کی اشاعت مشیت ایزدی کا تقاضا ہے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور جمع کرنا جہاد ہے بدور بازغہ میں فرماتے ہیں ۔

(کن من المجاھدین باخصاص الغرض الالہی الخ

تم اس فکر کو ملکی اور بین المملکتی ، قومی اور بین الاقوامی ، ملی اور بین الملی سطح پر غالب کرنے اور شائع کرنے کیلئے معیشت خداوندی کے علمبردار بن جاؤ ۔ کیونکہ یہ جہاد سے کم نہیں ۔

آخر میں اپنی معروضات کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اسلامی فکر کو عالمی سطح پر عام کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی توفیق ہمارے شامل حال فرمائے ۔ آمین

## حواشی

۱؎ ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ کی تعلیم" از مولانا غلام حسین صاحب جلبانی

۲؎ ملاحظہ ہو قرآن کریم کا مقصد اور سورۃ فاتحہ کی تفسیر ص ۳۷-۴۴-۴۵- نیز الہام الرحمٰن ص ۲۶

۳؎ شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۳۳۔ ۴؎ بدور بازغہ ص ۴۸ قولہ اقرار الانسان کالاعضاء نیز حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۱

۵؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۳۰ ۶؎ البدور البازغہ ص ۲۸ ۷؎ ۸؎ ملاحظہ ہو بحوالہ نمبر ۶؎

۹؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۲۹-۳۰

۱۱؎ بدور بازغہ ص ۹۴

۱۲؎ تاویل الاحادیث مع اردو ترجمہ مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد ص ۱۳

بدور بازغہ ۵۳- ۵۵- ۱۸۶- نیز تاویل الاحادیث ص ۵۰ بدور بازغہ ص ۱۸۹

۱۳؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۲۸- ۳۷- ۳۸- بدور بازغہ ص ۱۹۸

۱۴؎ حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۹ ۱۵؎ حجۃ اللہ البالغہ ج اوّل ص ۴۲

۱۶؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل ص ۴۳ بدور بازغہ ص ۶۶

۱۷؎ ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ بحث نسخ ادیان

۱۸؎ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۴۹- ۵۰- جلد دوم ص ۱۷

۱۹؎ ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۱۷۵

۲۰؎ بدور بازغہ ص ۱۹۲ نیز حجۃ اللہ البالغہ ج ثانی ص ۱۷ - تفہیمات ص ۱۰۱

# حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات

مولانا سید کاظم علی شاہ نزیل خطیب حیدرآباد

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات پر غائر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رب العزت نے آپ کی ذات گرامی کو قرآنِ پاک کی خدمات کے لئے ہی پیدا فرمایا تھا۔ چنانچہ جب آپ نے عمر کے ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے پانچویں سال میں قدم رکھا تو قرآنِ پاک پڑھنے کے لئے مکتب میں بٹھائے گئے۔ چونکہ روز ازل سے آپ کے ضمیری جوھر ربانی قابلیتوں سے آراستہ اور درخشاں ہو چکے تھے لہذا فقط دو سال کے عرصہ میں یعنی عمر عزیز کے ساتویں سال میں قرآنِ مجید ختم کرلیا۔ ہندی مثل کے مطابق، کہ پوت کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم عطیہ تھا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نونہال ہفت سالہ بچہ پورے قرآنِ پاک کے تلاوت کا حامل ہوکر اپنے شفیق اور فرشتہ صفت والدین کریمین کے ساتھ نماز تہجد میں شریک اور بارگاہ خداوندی میں کبھی دست بستہ اور کبھی دست دراز کئے ہوئے دعاؤں کا لطف حاصل کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں بقول حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ۔

ھوت نہ ڈٹھا نین ذرکا منہ خیال جیڈیون    مون جیکن نائون ہوندے جو ہیترا

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے والدین کریمین کی صحبت کیمیا اثر میں سوز و گداز کی لذت کا مزہ پایا اور ساتویں سال میں اپنے والدین کے معیت میں شب بیداری و دعائے نیم شبی کا ذوق حاصل کیا، اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں ہی سال میں فارسی کی کتابیں بھی شروع کیں۔ اور ایک ہی سال میں فارسی کی کتابیں ختم کر لیں۔ بقول شاہ عبداللطیف بھٹائی علیہ الرحمۃ

سياجبي سمزکي، تن پاسي پائي، الانسان سري وانا سره
ورتي ايڊاني راجا ڳائي، هوردي هيڪ ٿيا

یہ اسی شب خیزی و دعائے نیم شبی کا اثر تھا کہ حضرت قبلہ شاہ ولی اللہ صاحب اپنی عمر عزیز کے ابھی چودہ منزل ہی طے کرنے پائے تھے کہ علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اور دستار فضیلت سے آراستہ ہو کر میدان عمل میں گامزن ہوئے۔ اور معلم کی حیثیت سے درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔ فی الحقیقت اگر دیکھا جائے تو شاہ صاحب کے قرآنی خدمات کی یہ تیسری منزل ہے جس کو اس کمسنی میں طے کر رہے ہیں۔ لیکن بقول "ہر کسے را بہر کارے ساختند" معلوم ہوتا ہے قدرت نے شاہ صاحب کی طبعیت میں خدمات قرآنی کے وہ جواہر ودیعت رکھے تھے کہ جس کی بے بہائی مسلم ہے، اور یہ اتنی بطئی السیر سے طے منازل اسی جوہر کے بے تابی و بیقراری کی بین علامت ہے۔

اس درس و تدریس کے منزل کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ دھلی و اطراف دھلی میں دھوم ہو جاتی ہے۔ اور یہ بحر بے کنار ایک مدرسہ کے چو دیواری میں کہاں تھم سکتا تھا۔ اس کو تو اطراف عالم میں اپنے موجوں کے تھپیڑوں سے صدیوں کے سوئے ہوئے انسانوں کو بیدار کرنا اور ایک عظیم قرآنی انقلاب کو منظر عام پر لانا تھا۔

اب اس سریع السفر سیر فی بحر القرآن کا دور ختم کرتے ہوئے اسی بحر بے کنار کے اعماق میں دُر ہائے مخفیہ کی طلب دامن گیر ہوتی ہے اور تہہ در تہہ غوطہ زنی کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس کو تصویر نقوش دینے کے لئے شاہ صاحب نے حکومت ہند کی زبان جو اس وقت فارسی تھی اور مقبول عام بھی یہی زبان تھی۔ لہذا کلام الہٰی کو عام فہم کرنے کے لئے اسی مروجہ زبان میں ترجمہ کیا۔ حالانکہ حالات ناساعد تھے کیونکہ شاہ صاحب کی

پیدائش سنہ ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۳ء اور وفات سنہ ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۳ء جو سن ہجری کے اعتبار سے آپ کی عمر ۶۲ سال جو سید الکونین صلعم کے عمر میں ہم رنگی کا پتہ دے رہی ہے۔ جس طرح رسالتمآب صلعم کے دور کی نقاشی کرتے ہوئے لطیف سائیں فرماتے ہیں۔

پرڀو پنھوار، آيا ڄاڻي اجاري لاتو سڀ لوڪ تان ماٺيءَ ڏٺي مور
چوريون چوٽ سڪيون، پنھون ڪيائون پري آيا ڄاڻي اترجيون ڏکيون ڪمدي

بالکل اسی طرح فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا اس تاریک زمانہ میں نشو ونما پاکر ایسا آزاد خیال مفکر ومبصر منظر عام پر آتا ہے کہ جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہوکر سوچتا ہے اور اپنے فکر جدید سے منتشر ذہنوں میں ایک تخریب فاسد وتعمیر صالح کی تحریک سے تعمیر نو کا ایک اور دلآویز نقشہ پیدا کر دیتا ہے۔

ہزاراں سال نرگس اپنی بےنوری پہ روتی ہے ؎ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خود شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ :- "درایں زمانہ کہ ما درآنیم ودریں اقلیم کہ ما ساکن آنیم، نصیحت مسلمانان اقتضا می کند کہ - ترجمہ، قرآن عظیم بزبان فارسی سلیس وروزمرہ متداول ست تحریر کردہ شود"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک العلماء جناب شہاب الدین دولت آبادی جنہوں نے سنہ ۸۴۹ھ میں وفات پائی ہے۔ اور وہ شیر شاہ سوری کے استاد بھی تھے۔ ان کی فارسی زبان میں تفسیر "بحر المواج" کے نام سے پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن وہ زیادہ تر قرآن مجید کی شرح اور تفسیر ہے۔

اس کی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں :- "بحر مواج تفسیر قرآن مجید کردہ بعبارۃ فارسی، در وے بیان ترکیب ومعنی فصل ووصل دادہ است ودرایں جا نیز برائے سجع تکلفے کردہ ہست، قابل اختصار وتنقیح وتہذیب است"

اور حضرت مخدوم نوح ھالائی رحمتہ اللہ علیہ المتوفی ۹۹۸ھ نے برصغیر پاک وہند میں سب سے اول فارسی ترجمہ کیا ہے۔ جو ابھی شائع ہو رہا ہے۔

لیکن سید عبدالحی الحسنی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں شاہ صاحب کی پہلی فارسی زبان میں ترجمہ کے متعلق فرماتے ہیں :-

وھذہ الترجمہ من احسن التراجم لم یر نظیرھا فیما قبل ولا فیما بعد

ترجمہ۔ یہ قرآن پاک کے تراجم میں سے ایک بہترین ترجمہ ہے جو اسکی مثل نہ پہلے تراجم میں دیکھی جاتی ہے نہ بعد والوں میں مختصر کلام کہ شاہ صاحب کی یہ پہلی خدمت صفحۂ قرطاس میں ہے ترجمہ قرآن بفارسی زبان موسوم "فتح الرحمٰن" ۱۱۵۰ھ میں شروع کی اور ۱۱۵۱ میں اسکی تکمیل کی اور ۱۱۵۶ھ میں آپ نے فتح الرحمٰن کی تدریس بھی شروع کی۔ مزید برآں شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے مختصر طور پر تشریحی فوائد بھی لکھے[1] اور مقدمہ بھی۔ مولنا عبیداللہ سندھی ان تشریحی فوائد میں دو مثالیں تحریر فرماتے ہیں۔ جن کو سامعین کرام کے پیش نظر کرنا برمحل سمجھتا ہوں۔ تاکہ شاہ ولی اللہ کے قرآنی خدمات فکر و نظر کا انداز اور اس کی اہمیت کا معیار معلوم ہو سکے۔ مثال اول شاہ صاحب قبلہ آیت مبارکہ "کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قصاص سے یہاں مراد مساوات اور مماثلت ہے۔ قصاص کی یہ تعبیر غالباً آپ کو کسی تفسیر میں نہیں ملے گی۔ شاہ صاحب قبلہ رحمہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس آیت میں انسانی مساوات کو منبلئے حیات قرار دیا ہے۔ اور کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ ۔ الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ الخ یعنی مساوات فرض اور ضروری ہے۔ نیز اسی میں زندگی ہے اور حصول تقویٰ کا انحصار بھی اسی پر ہے[2]

میں طوالت مضمون سے بچتے ہوئے اس کا لب لباب جو مولنا سندھی نے اخذ کیا ہے پیش خدمت کرتا ہوں۔ مولنا موصوف فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ تمام بنی نوع انسان برابر ہیں۔ خواہ وہ اپنی قوم کے ہوں یا دوسری قوم کے سب مرد ہوں یا عورت غرضیکہ بحیثیت انسان ان میں فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ اور مساوات

---

[1] شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ص۶۴

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۱۷۵

انسانی ہی اصلی منہائے حیات ہے[۱]

حضرت قبلہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے فارسی ترجمہ فتح الرحمن کے تشریحی فوائد میں جن اعلیٰ مطالب اور بلند افکار کی طرف نشان دہی فرمائی ہے اس کی دوسری مثال سورۂ رعد کی ان آخری آیات اولم یروا انا نأتی الارض ننقصہا من اطرافہا واللہ یحکم لا معقب لحکمہ واللہ سریع الحساب" کے حاشیہ پر ملتی ہے۔ مورخین عموماً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی عہد سے اسلامی ریاست کی ابتدا مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مکے میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی کوئی باقاعدہ سیاسی حیثیت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ "رعد" کی باقی تمام سورت کو تو مکی کہتے ہیں) لیکن اس آیت کو مکی کے بجائے مدنی قرار دیتے ہیں اس کے خلاف شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ روز بروز اسلام کی شوکت سرزمین عرب میں ترقی پذیر تھی۔ اور اس کی وجہ سے دارالحرب کا اثر و اقتدار کم ہوتا جاتا تھا۔ عام مفسرین نے اس اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے۔ لیکن مترجم کے نزدیک ضروری نہیں کہ یہ آیت مدنی ہو۔ دارالحرب کے آثار و اقتدار کے کم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے اسلم، غفار، جہینہ اور یمن کے بعض دوسرے مسلمان ہو رہے تھے۔ یعنی کفار کی حکومت کا دائرہ کم و تنگ ہوتا جاتا رہا تھا۔ اور مسلمانوں کی حکومت روز بروز ترقی پر گامزن تھی[۲] اسی مضمون کی مزید وضاحت حضرت قبلہ شاہ صاحب کی تصنیف دوسری کتاب "فیوض الحرمین" میں ملتی ہے۔ جسکو طوالت مضمون کی وجہ سے چھوڑ کر شاہ صاحب قبلہ کے قرآن مجید کی خدمت بذریعہ تعلیم پر غور و فکر

---

۱۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۱۶۵

۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۶۷

کرنا۔ اور ان سے زندگی کے لئے شاہراہِ ہدایت ڈھونڈنا۔ پھر ان کی نشر و اشاعت کے لئے تعلیم گاہ بنانا اور اس میں راسخین فی العلم کی جماعت تیار کرنا یہ پہلا میدان ہے۔ جہاں شاہ صاحب نے اپنی عقل اور وجدان کی تکمیل شدہ قوتوں کو سب سے پہلے استعمال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے شاہ صاحب قبلہ کبھی عقد الجید میں بیضاوی جیسے مفسر پر بھی اعتراض کر جاتے ہیں[1] اس کو اصل کتاب میں مطالعہ کیا جائے۔ یہاں میں ایک تاریخی واقعہ لکھنا بہت مناسب سمجھتا ہوں کہ الشیخ معین الدین ٹھٹوی عرف مخدوم ٹھارو، جو مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کے استاد ہیں۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے طریقہ کے خلاف شاہ ولی اللہ کے طریقے کو ترجیح دینے کے لئے آپ نے دراسات اللبیب لکھی ہے۔ یہاں شاہ عبداللطیف بھٹائی جن کی کتاب الرسالہ مطبوعہ سندھی زبان میں ہے وہی درجہ رکھتی ہے جو فارسی میں مثنوی مولانا روم کا ہے اس کو ہندو اور مسلمان سب مساوی طور پر پڑھتے ہیں۔ بلکہ ایک انگریز H۔P سورلے نے شاہ لطیف آف بھٹ کے نام سے شاہ کے رسالہ کا ترجمہ انگریزی میں ایک ضخیم کتاب کی صورت لکھا ہے پر مشہور صوفی شیخ معین الدین ٹھٹوی کو اور شیخ معین الدین شاہ لطیف کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے اس کا اس عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا عبیداللہ[2] سندھی کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص۱۸۹ پر تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ محمد معین جب فوت ہونے لگے تو آپ نے وصیت فرمائی کہ میرا جنازہ تیار کر کے مسجد میں رکھا جائے اور شاہ عبداللطیف کا انتظار کیا جائے۔ شاہ عبداللطیف صحرانورد تھے کیا معلوم کہ وہ کس صحرا میں ہوں اور ان کو کس طرح اطلاع ملے اور کب آئیں؟ مگر جنازہ تیار ہونے کے تھوڑی دیر بعد آپ تشریف لے آئے اور امامت کرائی۔

---

[1] سندھی ترجمہ عقد الجید مترجم غلام حسین جلبانی ص۱۳۱

[2] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص۱۸۹

بعد کہا کہ آج کے بعد آنحضرت سے ہمارا تعلق منقطع ہوگیا ہے۔ اس بلند پایہ کے عالم و صوفی حضرت قبلہ شاہ ولی اللہ کے مسلک کی تائید فرمارہے ہیں۔ اور مولانا عبیداللہ سندھی الہام الرحمٰن ص۱۲ میں فرماتے ہیں۔ ولو لم یکن ھذا الامام لما کنا فطمئن بتفاسیر مثل الرازی والبیضاوی۔" (کہ اگر یہ امام یعنی شاہ ولی اللہ نہ ہوتے تو ہم رازی اور بیضاوی جیسے تفاسیر سے مطمئن نہ ہوتے۔

شاہ صاحب قبلہ نے جس حسن و خوبی سے علوم قرآنیہ کی خدمت کرتے ہوئے صفحۂ قرطاس کو مزین کیا ہے۔ اور جو طریقہ افہام و تفہیم اختیار کیا ہے، اسکو زمانہ حاضرہ کے ماہرین تعلیم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ مسٹر غلام حسین جلبانی صاحب پروفیسر سندھ یونیورسٹی اپنی ایک تصنیف شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص۱۳ پر فرماتے ہیں۔ کہ امام صاحب کے فہم و تفہیم کا طریقہ کچھ نرالا ہے۔ اسی صفحہ پر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اصول تفسیر کے بیان میں شاہ صاحب نے قرآنی مطالب اور علوم کو پانچ علوم میں تقسیم کیا ہے۔ آپ کی یہ تحقیق ہمیں تفسیر کی بڑی کتابوں میں بھی نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے مفہوم اور معنیٰ پانچ علوم سے باہر نہیں۔ اور قرۃ العینین ص۳۱۲ میں شاہ صاحب قبلہ خود فرماتے ہیں کہ۔ جمیع کتاب اللہ تتبع کردیم زیادہ از پنج علم نیافتم" اور فوزالکبیر ص۱ اول و باب اوّل کو شروع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ترجمہ۔ کہ وہ پانچ علوم جن کا قرآن عظیم نے تخصیص سے بیان فرمایا ہے، کہ معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن کی معنیٰ و مفہوم پانچ علوم سے باہر نہیں۔

(۱) علم احکام جس میں واجب مستحب مباح و مکروہ رحرام آجاتے ہیں یہ احکام خواہ عبادات میں سے ہوں یا معاملات میں سے ہوں تدبیر منزل سے متعلق ہوں یا سیاست مدن سے اس علم کی تفصیل فقہا کے ذمہ ہے۔

۲۔ علم مناظرہ چاروں گمراہ فرقوں سے یہود و نصاریٰ۔ مشرکین اور منافقین اس علم کی وضاحت متکلمین کے ذمہ ہے۔
۳۔ علم تذکیر بالآءِ اللہ مثلاً زمین و آسمان کے پیدا کرنے اور بندوں کو ان کی ضروریات کا الہام کرنے اور نیز خداوند تعالےٰ کی صفات کاملہ کا بیان کرنا ہے۔ اور چہارم علم تذکیر بایام اللہ سبحانہ وتعالیٰ یعنی ان واقعات کا بیان جن کو خداوند تعالےٰ نے ایجاد فرمایا ہے مثلاً طاعت کرنے والوں کو انعام و جزاسے نوازنا اور نافرمانوں کو تعذیب و سزا کا مزہ چکانا۔ پنجم علم تذکیر موت اور اس کے بعد کے واقعات کا بیان مثلاً حشر و نشر حساب میزان دوزخ و جنت ان علوم کی تفصیل کو محفوظ رکھنا اور ان کے مناسب احادیث و آثار کا ملحق کرنا ناصحوں و واعظوں کا کام ہے۔

واقعی ایسی جامع و مانع وضاحت یک جا بڑے بڑے تفاسیر میں بھی دکھائی نہیں دیتی، ایسی حد بندی سے حضرت شاہ صاحب ولی اللہ رحمہ اللہ کا ہی حصہ ہے کہ گویا سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے، اپنی کمال فراست سے قرآن فہمی کا ایک جدید طریقہ ایجاد کیا ہے جو قرآنی خدمات کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

حضرت ۔ قبلہ شاہ صاحب ولی اللہ کے خدمات قرآنیہ کو دس صفحات میں کیسے بند کر دیا جائے۔ اپنے مضمون کو تشنہ رکھتے ہوئے اب صرف ساغر کی طرف اشارہ سے کام لیتا ہوں۔

شاہ صاحب نے اپنی بے نظیر اصول تفسیر کی کتاب فوز الکبیر میں مسئلہ ناسخ و منسوخ کو متقدمین و متاخرین کے اصطلاحی و لغوی اختلاف کے جھنجھٹوں سے بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ مثلاً:۔

قال الامام جلال الدین سیوطی موافقا لابن العربی فی فعذہ احدیٰ وعشرین آیتہ منسوختہ علی خلافٍ فی بعضھا۔ یعنی امام جلال الدین سیوطی اور ابن العربی

کے نزدیک بعض آیات میں اختلاف رکھتے ہوئے ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیتے ہیں لیکن امام ولی اللہ کا نیا مکتب فکر سب آیات کا حل نکال کر باقی پانچ آیتوں کو منسوخ کہتے ہیں۔ جس کے لئے بھی مولنٰا عبیداللہ سندھی کی رائے ہے کہ ان پانچ آیتوں کی تطبیق نہایت آسان ہے۔ وہ اس طرح کہ ناسخ آیتوں کو (اولیٰ) کے حکم کے تحت سمجھیں اور منسوخ کو غیر اولیٰ کے تحت یا یہ کہ ایک عزیمت پر دلالت کرتی ہے تو دوسری رخصت پر دلالت کرتی ہے۔ غرض کہ مندرجہ بالا قاعدہ کی رو سے نسخ کے وہ معنی نہیں رہتے جو متاخرین نے اختیار کئے ہیں اور جن کی رو سے منسوخ شدہ آیتوں پر عمل کرنا مطلقاً جائز نہیں۔ بہرکیف امام ولی اللہ نسخ کے مسئلہ کو ایک اجتہادی امر سمجھتے ہیں اور اس میں متاخرین کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ قرآن پاک میں آیات محکمات و متشابہات کا ہے چونکہ قرآن پاک میں ان کا تعین نہیں ہے۔ لہٰذا ایک بڑی الجھن اور مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکو بھی شاہ صاحب نے بہت حسن و خوبی سے واضح کیا ہے۔ راسخین فی العلم کی تعریف کرتے ہوئے معاملہ ختم کر دیا ہے۔

المختصر کہ شاہ صاحب کی مشہور عالم کتاب حجۃ اللہ البالغہ۔ یا فوز الکبیر یا خیر کثیر۔ ہمعات، وغیرہ جتنی کتابیں ہیں گویا شاہ صاحب کے الفاظ میں قرآنی خدمت انجام دے رہی ہیں۔

گوئ سعادت میان افتادہ اند
کس بمیدان در نمی آید سوارا را چہ شد

کہکر اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

۲- علم مناظرہ چاروں گمراہ فرقوں سے یہود و نصاریٰ۔ مشرکین اور منافقین اس علم کی وضاحت متکلمین کے ذمہ ہے۔
۳- علم تذکیر بالآء اللہ مثلاً زمین و آسمان کے پیدا کرنے اور بندوں کو ان کی ضروریات کا الہام کرنے اور نیز خداوند تعالےٰ کی صفات کاملہ کا بیان کرنا ہے۔ اور چہارم علم تذکیر بایام اللہ سبحانہ و تعالیٰ یعنی ان واقعات کا بیان جن کو خداوند تعالےٰ نے ایجاد فرمایا ہے مثلاً طاعت کرنے والوں کو انعام وجزا سے نوازنا اور نافرمانوں کو تعذیب و سزا کا مزہ چکانا۔ پنجم علم تذکیر موت اور اس کے بعد کے واقعات کا بیان مثلاً حشر و نشر حساب میزان دوزخ و جنت ان علوم کی تفصیل کو محفوظ رکھنا اور ان کے مناسب احادیث و آثار کا ملحق کرنا ناصحوں و واعظوں کا کام ہے۔

واقعی ایسی جامع و مانع وضاحت بیک جا بڑے بڑے تفاسیر میں بھی دکھائی نہیں دیتی، ایسی حد بندی سے حضرت شاہ صاحب ولی اللہ رحمہ اللہ کا ہی حصہ ہے کہ گویا سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے، اپنی کمال فراست سے قرآن فہمی کا ایک جدید طریقہ ایجاد کیا ہے جو قرآنی خدمات کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

حضرت۔ قبلہ شاہ صاحب ولی اللہ کے خدمات قرانیہ کو دس صفحات میں کیسے بند کر دیا جائے۔ اپنے مضمون کو تشنہ رکھتے ہوئے اب صرف ساغر کی طرف اشارہ سے کام لیتا ہوں۔

شاہ صاحب نے اپنی بے نظیر اصول تفسیر کی کتاب فوز الکبیر میں مسئلہ ناسخ و منسوخ کو متقدمین و متاخرین کے اصطلاحی و لغوی اختلاف کے جھنجھٹوں سے بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ مثلاً:-

قال الامام جلال الدین سیوطی موافقا لابن العربی فھذہ احدیٰ و عشرین آیۃ منسوخۃ علی خلاف فی بعضھا۔ یعنی امام جلال الدین سیوطی اور ابن العربی

کے نزدیک بعض آیات میں اختلاف رکھتے ہوئے ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیتے ہیں لیکن امام ولی اللہ کا نیا مکتب فکر سب آیات کا حل نکال کر باقی پانچ آیتوں کو منسوخ کہتے ہیں۔ جس کے لئے بھی مولانا عبیداللہ سندھی کی رائے ہے کہ ان پانچ آیتوں کی تطبیق نہایت آسان ہے۔ وہ اس طرح کہ ناسخ آیتوں کو (اولی) کے حکم کے تحت سمجھیں اور منسوخ کو غیر اولی کے تحت یا یہ کہ ایک عزیمت پر دلالت کرتی ہے تو دوسری رخصت پر دلالت کرتی ہے۔ غرض کہ مندرجہ بالا قاعدہ کی رو سے نسخ کے وہ معنی نہیں رہتے جو متاخرین نے اختیار کئے ہیں اور جن کی رو سے منسوخ شدہ آیتوں پر عمل کرنا مطلقاً جائز نہیں۔ بہرکیف امام ولی اللہ نسخ کے مسئلہ کو ایک اجتہادی امر سمجھتے ہیں اور اس میں متاخرین کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ قرآن پاک میں آیات محکمات و متشابہات کا ہے چونکہ قرآن پاک میں ان کا تعین نہیں ہے۔ لہٰذا ایک بڑی الجھن اور مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکو بھی شاہ صاحب نے بہت حسن و خوبی سے واضح کیا ہے۔ راسخین فی العلم کی تعریف کرتے ہوئے معاملہ ختم کر دیا ہے۔

المختصر کہ شاہ صاحب کی مشہور عالم کتاب حجۃ اللہ البالغہ۔ یا فوز الکبیر یا خیر کثیر۔ ہمعات۔ وغیرہ جتنی کتابیں ہیں گویا شاہ صاحب کے الفاظ میں قرآنی خدمت انجام دے رہی ہیں۔

گوئی سعادت ... ہمیاں (فتادہ اند
کس ہمیساں درنمی آید سوارا راچہ شد

کہکر اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

# شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کارنامے

مولانا محمد اسلم استاذ اسلامیات غزالی کالج لطیف آباد

حضرت شاہ ولی اللہ کی قدر و منزلت ایک دنیا پر آشکارا ہے یہ شاہ صاحب ہی کا فیضان ہے جو ہمیں تحریک آزادی ہند، تحریک شہید، تحریک خلافت اور تحریک اقامت دین اور تحریک پاکستان کی شکل میں مسلسل جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اسلامی نظام حیات اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی وہ دل آویز تصویر جو اس دہلوی شیخ نے کھینچ دی۔ مسلمانان ہند و پاک کے دل و دماغ میں پوری طرح رچ بس چکی ہے۔ اور آج تک اسی آواز کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ تحریک پاکستان میں جان اسی تصور نے ڈالی اور اسلامی نظام حیات کے قیام کی یہی آرزو تھی جس کے باعث ایک زمانے کی سوئی ہوئی قوم ایک آواز پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور آج سرزمین پاک کی شکل میں آرزوؤں بھرا خطۂ ارض نظر افروز ہے۔ یہ وہی آرزو تھی جس کی بازگشت ہم پھر جہاد ستمبر میں داد سرفروشی کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ پھر وہی کلمہ دل نواز تھا۔ وہی سرفروشی تھی اور نتیجہ سامنے ہے۔

ایسا زبردست مفکر اس قدر اعلیٰ درجہ کا قائد و محسن جسکی آواز پوری قوم کو ایسا انمٹ درس حیات دی گئی ہے۔ اسے اپنے محسن کا بہرحال شکر گزار ہونا چاہیئے تھا

جگہ جگہ اکیڈمیاں قائم ہوتیں۔ تعلیم کو عام کرنے کا بندوبست کیا جاتا۔ جامعہ ولی اللہی کا قیام عمل میں آتا۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ مقام شکر ہے کہ اب چند ادارے اس عظیم کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وجود میں آ چکے ہیں اللہ تعالےٰ ان اداروں کو توفیق بخشے کہ وہ شاہ صاحب کے پیش کردہ افکار و خیالات کو جدید اسلوب بیان اور زبان میں پیش کر سکیں۔ اس لئے کہ یہ کام فی الوقت نہایت ضروری ہے۔ نئی نسل جس زبان و بیان سے مانوس ہے وہ گذشتہ زمانے سے بڑی حد تک مختلف ہے

## شاہ صاحب کے کارنامے

شاہ صاحب کے کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ میں چند کو نمبروار درج کر رہا ہوں۔

۱۔ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے بڑی ژرف نگاہی کے ساتھ اجتہاد و تفقہ کے کام میں غلط اجتہاد کے دروازے کو بند کیا۔ اور اس شاہراہ کو زیادہ واضح اور صاف شکل میں پیش فرمایا۔

۲۔ کار تجدید کی وضاحت کی اور اس طرح تجدد کی کامیابی اور مسلمانوں میں در آنے کا راستہ بند کیا۔

۳۔ علوم حدیث کی تجدید و ترویج کا کام کیا۔

۴۔ قرآن مجید کے ترجمہ کو جاری کیا۔

۵۔ اسلامی نظام سیاست کی تصویر کشی کی۔

۶۔ تصوف کی حتی المقدور اصلاح کی۔

۷۔ اسلامی نظام حیات کی تدوین کا انجام دیا۔

اب میں ان میں سے ایک ایک پر اپنے مطالعہ کے نتائج کو پیش کرنے کی سعی کروں گا۔

# اجتہاد

اس فہرست میں سب سے مقدم یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اجتہاد و تفقہ کے کام میں غلط اجتہاد کے دروازے کو بند کرنے کی سعی کی۔ آپ نے مجتہد کے دائرۂ کار کو متعین طور پر واضح کیا۔ اجتہاد کی شرائط بیان کیں اور مجتہدین کے درمیان فرق مراتب قائم کئے پھر یہ بھی واضح کیا کہ کون سا دروازہ کھلا ہوا ہے اور کون سا بند ہے۔ اجتہاد کی پوری تاریخ اور اس کے اختلافات کو بیان کیا اور یہ بھی بتادیا کہ مسلک اعتدال کیا ہے۔ یہ پوری بحث چونکہ نہایت اہم مباحث پر مشتمل ہے اس لئے میں اسکو قدرے تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس تفصیلی تذکرہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تقریباً یہی شرائط تجدید کے کام کی بھی ہیں اس طرح اجتہاد و تجدید کے پورے کام کی شکل تصویر سامنے آجائے گی۔ اس پوری بحث کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اجتہاد کیا ہے۔

## اجتہاد کیا ہے

اس کو سمجھنے کے لئے دو بنیادی امور کو وضاحت کے ساتھ سامنے رہنا چاہیئے۔

پہلی بات۔ حاکمیت الٰہی کا تصور ہے اس لئے کہ اسلامی اجتہاد و تفقہ کے فہم میں اس کی حیثیت سر رشتہ کی ہے اسلام میں حاکمیت مطلقہ صرف اللہ تعالےٰ کے لئے تسلیم کی گئی ہے۔ وہ صرف عام مذہبی معنوں میں معبود نہیں ہے بلکہ خالص قانونی معنوں میں حاکم مطاع، قانون بنانے والا اور دینے والا اور امر و نہی کا اصل سرچشمہ بھی ہے۔ وہ صرف قانون فطرت کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ ہمیں صفائی سے بتاتا ہے کہ الٰہی قانون میں شریعت بھی شامل ہے۔ اور اس شرعی قانون کو ماننے اور اس کے مقابلے میں اپنے اختیارات سے دست بردار ہوجانے کا نام اسلام ہے وہ ہمیں وضاحت سے بتاتا ہے کہ جن معاملات میں اللہ اور رسول نے جب کوئی فیصلہ کردیا ہو تو اس میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے اور مصلحت کے پیش نظر کوئی فیصلہ کرے ارشاد ہوتا ہے

| | |
|---|---|
| وما کان لمومن ولا مومنۃ | اور کسی مومن اور مومنہ کے لئے جائز نہیں |
| اذا قضی اللہ ورسولہٗ امراً ان | ہے کہ وہ ان معاملات میں اللہ اور اس کا |
| یکون لھم الخیرۃ من امرھم | رسول کوئی فیصلہ کر دیں۔ تو اس میں انہیں |
| ومن یعص اللہ ورسولہٗ فقد | اختیار ہو اور جو شخص اللہ اور اس کے |
| ضل ضلالاً مبینا۔ (الاحزاب ۳۶) | رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی گمراہی |
| | میں جا پڑے گا۔ |

دوسری بات جو پہلی بات کی طرح قطعی بنیادی اہمیت کی حامل ہے یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ یہی عقیدہ ہے جس کی بنیاد پر مجرد روح اسلام مادی جامہ اختیار کرتی ہے۔ اس بنیاد پر اسلامی تخیل پر محسوس مادی عمارت تعمیر ہوتی ہے اسلامی نظام میں محمدی تعلیم بالاتر قانون ( Supreme Law ) کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی تعلیم حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتی ہے۔

## تعلیم کی دو شکلیں

ہمیں یہ تعلیم دو شکلوں میں ملی ہے۔ ایک قرآن دوسرے آپ کا عمل بھی قرآن کی اصطلاح میں اسوۂ حسنہ ہے جو قرآن کی توضیح و تبیین کرتا ہے ارادۂ الٰہی جب عمل رسول کے ساتھ آمیز ہوتی ہے تب شریعت الٰہی وقوع میں آتی ہے۔ روح اسلام یعنی ارادۂ الٰہی اور آپ کے عمل کا تعلق چولی دامن کا تعلق ہے جس طرح روح اسلام لازوال ہے اس طرح اس کا قالب بھی غیر مبدل ہے۔ یہی شریعت ہے اور اور اس شریعت پر عمل ارادہ الٰہی کی تکمیل ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے ارادۂ الٰہی کی تکمیل ناممکن ہے۔ یہ ساری بحث شاہ صاحب نے اپنی بیشتر تصنیفات میں اپنے مخصوص پیرایۂ بیان میں ظاہر کی ہیں۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر حجۃ اللہ البالغہ۔ عقد الجید۔ اور تفہیمات کو نیز بدور بازغہ کو سامنے رکھنا چاہیئے۔

# اجتہاد کی ضرورت

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شریعت الٰہی کی تعمیل میں اجتہاد کی ضرورت کب اور کیوں پیش آتی ہے۔

انسان چونکہ مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اس لئے اس کی سرشت میں تمدن و تہذیب داخل ہے۔ تمدن و تہذیب کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ ترقی پذیر ہے۔ ترقی جن احوال و اسباب کی مرہون منت ہے ان احوال و اسباب کے تغیر سے ترقی بسا اوقات تنزل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر آن تغیر پذیر زندگی میں احوال و ظروف کی تبدیلی سے استثنا کے تقاضے بھی ابھرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کہ احوال و ظروف کے ان ہی تغیر و تبدل کے باعث شریعت کے انطباق کی ضرورت ہر دور اور ہر زمانے میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور اس سے کسی نسل کو مفر نہیں ہے۔ اس بات کو شاہ صاحب تفہیمات میں اس طور پر بیان فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب و سنت استغنا حاصل نیست۔

امت کو کسی وقت بھی کتاب و سنت پر اجتہادات کو پیش کرنے سے استغنا حاصل نہیں ہے۔

امصفی میں تحریر فرماتے ہیں۔

تفصیل ایں مجمل آنست کہ اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است و مراد اینجا نہ اجتہاد مستقل است مثل اجتہاد شافعی مسائل کثیر الوقوع غیر محصور اند..... وانچہ مسطور شدہ است غیر کافی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اجتہاد ہر زمانے میں فرض کفایہ ہے لیکن اس جگہ مراد اجتہاد مستقل نہیں ہے جیسا کہ اجتہاد شافعی۔ مسائل کثیر الوقوع بے شمار ہیں اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ناکافی ہے۔

# ایک غلط فہمی کا ازالہ

اجتہاد کے معاملے میں ایک عرصے سے شور سننے میں آرہا ہے کہ اس کا دروازہ جو عرصہ سے بند پڑا ہوا ہے کھولا جائے۔ موافق و مخالف دونوں غالباً اس بات پر متفق ہیں کہ دروازہ بند ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ دروازہ ایک دن کے لئے بھی بند نہیں ہوا ہے۔ اجتہاد ہر دور میں اور ہر زمانے میں کیا جاتا رہا ہے۔ فرق صرف اجتہاد مطلق اور اجتہاد مقید میں رہا ہے۔

# اجتہاد کی دو قسمیں

شاہ صاحب الانصاف میں لکھتے ہیں۔ اجتہاد دو طرح کا ہوتا ہے ایک مطلق دوسرا مقید۔ شاہ صاحب نے اس پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے میں امام شاطبی کی تعریف کو نقل کر رہا ہوں اس کی غرض اختصار کے علاوہ تائید بھی ہے۔ چنانچہ امام شاطبی اپنی کتاب موافقات کے باب اجتہاد میں لکھتے ہیں۔

الاجتہاد علی ضربین احدھما لا یمکن ان ینقطع حتی ینقطع اصل التکلیف وذلک عند قیام الساعۃ والثانی یمکن ان ینقطع قبل فناء الدنیا۔ اما الاول فھو الاجتہاد المطلق۔ وھو الذی لا اختلاف بین الامۃ فی قبولہ۔

اجتہاد مطلق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا انقطاع ممکن نہیں۔ حتی کہ انسان کی مسئولیت ہی ختم ہو جائے اور یہ قیامت سے قبل ممکن نہیں۔ دوسرا وہ ہے جس کا انقطاع دنیا کے فنا سے قبل ممکن ہے۔ پہلا اجتہاد مطلق ہے اور اس کی قبولیت کے معاملے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

یہی اجتہاد مطلق ہے جس کے بند ہونے پر امت کا اتفاق ہے شاہ صاحب علامہ جلال الدین سیوطی کا قول تائید میں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وان المطلق کما قرر فی کتاب

چنانچہ خود ابن صلاح نے اپنی کتاب

آداب الفتیا والنووی فی شرح المہذب نوعان مستقل وفقد فقد من راس اربع مأتہ فلم یکن وجودہ۔

آداب الفتیا اور امام نووی نے شرح المہذب میں اس کی تصریح کی ہے ان میں سے پہلی قسم کے اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل ہی میں ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ جسکے کھلنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔

اس بات کی تائید میں ائمہ اربعہ کے اجتہادات سے باہر نہ جانے کے بارے میں اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں۔

وثانیھا الوصاۃ بالتقلید بھذہ المذاھب الاربعۃ لا اخرج منھا والتوفیق ما استطعت۔

مجھے حضور نے جو تین وصیتیں فرمائیں ان میں سے دوسری یہ تھی کہ مذاہب اربعہ کی تقلید کروں اور اس دائرہ سے قدم باہر نہ نکالوں۔ اور حتی المقدور انکے اجتہادات کی موافقت کروں۔

اس کی حکمت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ان فی الاخذ بھذہ المذاھب الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ من وجوہ ان الزمان لما طال وبعد العھد وضیعت الامانات لم یجز ان یعتمد علی اقوال العلماء السوء۔

ان مذاہب اربعہ میں دائر رہنے میں دوسری باتوں کے علاوہ ایک عظیم مصلحت یہ بھی ہے کہ عہد رسالت کو گذرے ہوئے مدت گذر چکی ہے امانتیں ضائع ہوچکیں تو اب یہ جائز نہیں ہے کہ علماء سو کے اقوال وآراء پر اعتماد کیا جائے۔

اس کتاب میں ایک جگہ یہ تصریح بھی کرتے ہیں کہ اجتہاد میں اولین طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ مذہب حنفی کے تینوں شیوخ (یعنی ابو حنیفہ، محمد و ابو یوسف) کے اقوال کو دیکھا جائے اور جو اقرب الی السنۃ ہو اسے اختیار کر لیا جائے۔

## اجتہاد مطلق کے بند ہونے کا سبب

اس سلسلے میں شاہ صاحب مختلف مقامات پر بحث کرتے ہیں اس کا خلاصہ ابوزہرہ مصری کی زبانی سنئے ۔ سیرت ابن تیمیہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں ۔

چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد مطلق کے دروازے کے بند ہونے پر جو اتفاق ہوا اسکی اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں ۔

۱ ۔ شریعت الٰہی کے دائمی اصول و کلیات مدون ہو چکے تھے اور انہیں پر مختلف مذاہب کی کتابیں مدون ہو چکی تھیں ۔ اور اب اصول و کلیات میں کسی نئے اجتہاد کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے ۔

۲ ۔ اجتہاد کے لئے متعلقہ علوم میں جس مجتہدانہ بصیرت کی ضرورت اس سے لوگ دور ہو چکے ہیں ۔

۳ ۔ اجتہاد مطلق کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہیں ۔

## اجتہاد مقید

جہاں تک اجتہاد مقید کا تعلق ہے تو اس کا دروازہ ہر دور میں کھلا رہا ہے ۔ اور آج بھی بند نہیں ہے ۔ پانچویں صدی ہجری میں سود کے اشکال سے بچنے کے لئے بیع الوفاء کے احکام وضع کئے گئے ۔ اور تمام متاخرین فقہا نے قرض خواہوں کی رضامندی کے بغیر قرضدار کے تمام تصرفات جیسے وقف ، ہبہ وغیرہ ممنوع قرار دیئے ۔ اس طرح ہر دور میں جو اجتہادات کئے گئے ہیں ۔ ان سب کے نظائر موجود ہیں ۔ اس موجودہ دور میں بھی اجتہاد کے نظائر نہ صرف یہ کہ ملتے ہیں بلکہ کثیر ہیں ۔ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ، رویت ہلال سے متعلق شریعت کے مقاصد کی توضیح ، عورت کی امارت و قضاء کے استثنار کا مسئلہ ، بندش ولادت کے بارے میں شرعی احکام بنیکنگ اور انشورنس اور ان جیسے دوسرے مالی معاملات میں شریعت

کے احکامات کی تشریح، الحیلۃ الناجزہ یعنی مفقود الخبر شوہر کی عدت و انتظار کے بارے میں فتوی کی تبدیلی۔ یہ سب باب اجتہاد و قضا اور فتوے سے تعلق رکھنے والے ہیں۔
اجتہاد مقید کی شاہ صاحب نے بھی اور دوسرے فقہاء و مجتہدین نے اپنے فہم کے مطابق تقسیم کی ہے۔
اس کی قسمیں خواہ کتنی ہی ہوں بہر حال سب میں ہمت و صلاحیت کے بقدر اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بلکہ شاہ صاحب الانصاف میں تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کسی دور میں مجتہدین مطلق منتسب (جو اجتہاد مقید کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے) کی ذمہ داریوں کو ترک کر دیا جائے تو پوری امت گنہگار ہوگی۔

## اجتہاد کے بنیادی اصول

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اجتہاد کا وہ کون سا دائرہ ہے جس کے اندر رہ کر ہی اجتہاد کیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ عبادات اور ما بعد الطبیعاتی امور میں اجتہاد کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ نہ تو یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ خدا کس کام سے خوش ہوگا اور کس سے ناخوش اور اسی طرح ماورائے طبعی مسائل میں کوئی سر رشتہ ہاتھ نہیں آ سکتا جس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ اس میں تو بس رسول کی تقلید کے سوا چارہ نہیں۔ البتہ معاملات میں جہاں اللہ و رسول کی کوئی ہدایت نہ ملتی ہو اجتہاد کی اجازت ہے۔ لیکن یہ اجازت بھی غیر مشروط نہیں ہے۔ مقاصد شریعت شریعت الٰہی کی مجموعی اسکیم۔ اس کا مزاج اور اس کی روح سب کو ملحوظ رکھنا ہوگا تا کہ ایسا نہ ہو کہ اس طرح کا اجتہاد کر ڈالا جائے جو سرے سے شریعت کی مجموعی اسکیم یا اس کے مزاج و روح کے خلاف ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شاہ صاحب اسباب اختلاف الصحابہ والتابعین فی الفروع کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وان لم یجد فیما حفظہ واستنبطہ ما یصلح للجواب اجتہد برائہ | اگر کسی صحابی کو اپنے معلومات و استنباط میں کوئی چیز ایسی نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا |

وعرف العلة امتی ادلۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیھا الحکم فی منصوصاتہٖ نظروا الحکم حیثیت ما وجدھا ولا یالوا جھدا فی موافقۃ غرضہ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

کا جواب دے سکتا تو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا اور اس علت کو معلوم کرنا جس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی ہے پھر جس مقام پر اس کو وہی علت نظر آجاتی وہاں وہ وہی حکم لگا دیتا۔ مگر ایسے قیاسات کرتے وقت یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ کے مقصد کا لحاظ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

اس سلسلے کی امام شاطبی نے اپنی کتاب الاعتصام جلد دوم میں نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے انہیں وہاں ملاحظہ کرنا چاہیئے۔

## اجتہاد کے شعبہ ہائے کار

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اجتہاد کے شعبہ کون کون سے ہیں جن میں اسے اپنے فرائض انجام دینے ہیں۔

معاملات میں اجتہاد کے چار شعبے قرار دیئے گئے ہیں۔

۱۔ نصوص کے معنی، مفہوم اور منشار کو متعین کرنا۔

۲۔ جن معاملات میں شارع نے کی تو حکم نہیں دیا ہے۔ لیکن اس سے ملتے جلتے معاملات میں جو حکم دیا گیا ہے ان میں علت کی تشخیص کر کے دوسرے معاملات میں جاری کرنا۔

۳۔ شریعت کے بیان کردہ کلی اصولوں کو جزوی مسائل پر منطبق کرنا اور یہ دیکھنا کہ نصوص کے اشارات، دلالتوں، اور اقتضاءات کے اعتبار سے جزوی معاملات کو شریعت کے کلی مزاج سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔

۴۔ جن معاملات میں شارع کی کوئی ہدایت نہیں ملتی اور نہ کسی کلیئے کے تحت وہ آسکتے

ہوں تو ایسے معاملات میں شریعت کے وسیع تر مقاصد و مصالح اور مزاج کو ملحوظ رکھ کر ایسے قانون وضع کرنا اور ضابطے بنانا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح اور اس کی کلی اسکیم کے خلاف نہ ہو۔ ایسی قانون سازی اور اجتہاد کو اصطلاح میں استحسان مصالح مرسلہ اور استصحاب کا نام دیا گیا ہے۔

شاہ صاحب نے ان تمام مسائل پر متعدد مقامات پر اشارے کئے ہیں۔ اس پر یہ بحث مرتب شکل میں الاعتصام جلد دوم میں امام شاطبی نے درج کی ہے۔

## شرائط اجتہاد

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شاہ صاحب وہ کیا شرائط بیان کر رہے ہیں جو ایک شخص کے مجتہد بننے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ وہ شرائط ہیں جن کو شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ یہ تقریباً ایک ہزار سال سے امت کے نزدیک مسلّمہ شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بحث شاہ صاحب نے الانصاف میں مفصل کی ہے۔ تفہیمات الہیہ میں بھی اشارے ملتے ہیں۔ ان شرائط کو شاہ صاحب علوم پنجگانہ کے نام سے موسوم فرماتے ہیں۔ اور اسکے وجوب پر بھی اچھی بحث کرتے ہیں۔ میں صرف خلاصہ پیش کروں گا۔

### پہلا اصول

یہ ہے کہ آدمی اس زبان کو اور اسکے قواعد، محاوروں کو اور ادبی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو جو قرآن و سنت اور شریعت اسلامی کی اپنی زبان ہے۔

**دوسرا اصول** یہ ہے کہ آدمی نے قرآن مجید کا اور ان حالات کا جن میں قرآن نازل ہوا ہے گہرا مطالعہ کیا ہے۔

**تیسرا اصول** یہ ہے کہ سنت کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے تمام رکارڈ سے براہ راست ہو اور نقد حدیث میں اسے اچھی مہارت ہو۔

**چوتھا اصول** یہ ہے کہ آدمی شریعت الٰہی کی عملی تطبیق، اس کے ادوار، اجتہاد کے زمانی تسلسل اور اس سلسلے کے تمام رکارڈ سے براہِ راست واقف ہو۔ اور یہ واقفیت اتفاً

کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

**پانچواں اصول۔** یہ ہے کہ آدمی ایمانداری کے ساتھ اسلامی اقدار، طرز فکر اور خدا و رسول کے احکام کی صحت کا معتقد ہو۔ اور رہنمائی کے لئے باہر نہ دیکھے۔

ظاہر ہے ان شرائط و اصول کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی اجتہاد آخر امت کو کس طرح قابل قبول ہوگا اور تاریخ شاہد ہے کہ ان شرائط کا لحاظ کئے بغیر جب بھی کوئی اجتہاد کیا گیا تو مسلم معاشرے نے ہرگز قبول نہیں کیا۔ اگر ڈنڈے کے زور سے اب کوئی اجتہاد مسلط کیا گیا تو ڈنڈے کے ساتھ ہی وہ بھی رخصت ہو گیا۔

## فقہی مسالک میں اعتدال کی راہ

اب میں اس مسئلہ کی طرف آتا ہوں کہ اجتہاد کی تاریخ میں جو اختلافات کا باب ہے اس میں شاہ صاحب نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب نے اپنی کتاب الانصاف میں بڑی حکیمانہ گفتگو فرمائی ہے اول تو پوری کتاب اس نقطۂ نظر کے تحت لکھی گئی ہے۔ لیکن آخری باب میں جس نقطۂ عدل پر انگلی رکھ دی ہے وہ سب سے حیرت انگیز ہے۔ اس باب میں شاہ صاحب شریعت الٰہی کے مزاج فہمی کے جس بلند مقام پر نظر آتے ہیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے سید سلیمان ندوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عالم اسلام میں تین شخصیتیں اتنی نمایاں ہیں کہ مینارۂ نور نظر آتی ہیں۔ ایک ابن حزم اندلسی دوسرا ابن تیمیہؒ اور تیسرے شاہ صاحب اور شاہ صاحب تو ان سب میں بازی لے گئے ہیں۔

غرضکہ شاہ صاحب نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس نقطۂ عدل پر انگلی رکھ دیئے ہیں جو شریعت کے مزاج سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اہل فقہ والے اور اہل حدیث دونوں کے لئے جائز شرعی طرز عمل کی تعین کی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ نقطۂ عدل کو پالینے کے بعد قوم میں اختلافات قطعی ختم تو نہیں ہوئے۔ لیکن جن لوگوں کی تاریخ اجتہاد و تفقہ پر نظر ہے وہ گروہی عصبیتوں میں کمی کے رجحان میں

الانصاف کے مسلک اعتدال کی کارفرمائی ضرور دیکھ رہے ہیں۔ تحریک شہید کے واقعات میں ہم مسلک اعتدال کی پوری جھلک پاتے ہیں افسوس کہ تحریک کے خاتمہ سے اس مقصد کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اور وہ کام جس کی توقع بجا طور پر کی جا سکتی تھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

## دوسرا کارنامہ

شاہ صاحب کا دوسرا کارنامہ کار تجدید پر سیر حاصل بحث ہے اس ذیل میں تجدید کی ضرورت مجددین کی صفات کار تجدید کی شرائط اور اپنے تجدیدی کام کی ضرورت اور حدود کار کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور اس طرح مجدد و متجدد کے فرق کو واضح کر دیتے ہیں۔ اور تجدد کے راستہ کو قطعی بند کر دینے کی سعی کرتے ہیں۔

## کار تجدید کی ضرورت کیوں

اس کارگاہ عالم میں کسی قوم و گروہ کو دوام حاصل نہیں ہے جس طرح شخصی حالات و کیفیات بدلتی رہتی ہیں اسی طرح قوموں میں بھی ترقی و منزل کے ادوار آتے رہتے ہیں یہ دنیا مختلف صحیح و غلط نظامہائے حیات کی رزم گاہ ہے۔ کبھی کوئی قوم غالب آتی ہے اور کبھی دوسری ترقی و تنزل کا یہ چکر جو نظام حیات کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں ہوتا ہے اس لئے قوموں میں ذہنی پراگندگی اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ غالب قوم کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ مغلوب قوم کبھی اس کے پنجۂ اقتدار سے باہر نہ جا سکے۔ اس کے لئے وہ اس نظام حیات کو بھی جس پر مغلوب قوم اپنی زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے حملہ آور ہو جاتی ہے۔ ذہن و فکر سے لے کر کردار و عمل تک ہر جگہ نفوذ کی کوشش کرتی ہے اور ہر جگہ شکست و ریخت کے آثار ابھر آتے ہیں۔ قوم کا مغلوب و متاثر عنصر غالب تمدن کی ہر صحیح و غلط باتوں کو اپنے نظام میں کھپانے کی کوشش شروع کرتا ہے اور اس طرح اگر کوئی نظام کمزور ہو تو جلد پیوند زمین ہو جاتا ہے ورنہ کچھ نہ کچھ تغیرات تو بہر حال ہو جاتے ہیں۔

# تجدید حق

ایسی حالت میں ایک مجدد برحق کا کام یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات کی شکل و روح میں جو بگاڑ آیا ہو، اس کے توازن میں اختلال واقع ہوا ہو۔ اسے ان تمام خرابیوں سے پاک کرکے اجتہاد و تجدید کی غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ نئے سر سے انسانوں کے ذہن و عمل میں غالب اور جاری و ساری کردے۔

شاہ صاحب اپنی کتاب تفہیمات الہیہ میں متعدد مقامات پر اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ تجدید کے شرائط بیان کئے اسکے حدود کار کو بتایا ہے اور خود اپنی اصلاح کے نقاط کو واضح کیا ہے۔ اس طرح آیندہ کے لئے تجدید کی صاف اور سیدھی راہ کھولی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تاریخ میں یہ کام انتہائی دوررس نتائج کا حامل ہے۔

## تیسرا کارنامہ

**علم حدیث کی تجدید**۔ تجدید و اجتہاد کے کام کے لئے علوم حدیث کی جس قدر ضرورت ہے وہ اظہر من الشمس ہے فی الحقیقت اس علم کے بغیر اجتہاد و تجدید کے باب میں ادنیٰ کام بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اہمیت کے پیش نظر شاہ صاحب نے باقاعدہ اس علم کی توسیع کا پروگرام بنایا۔ اس سے قبل عالم اسلام کا جو حال تھا اس کی داستان علامہ رشید رضا مصری سے سنئے سید صاحب مفتاح کنوز السنہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

> "اگر ہمارے بھائی علمائے ہند نے اس اخیر زمانے میں حدیث نبوی پر اپنی توجہ نہ مبذول کی ہوتی تو علم حدیث کا خاتمہ ہو چکا ہوتا کیونکہ دسویں ہجری ہی میں مصر و شام، عراق و حجاز میں علم حدیث کا چرچا کم ہو چکا تھا۔ اور چودھویں صدی کے اوائل تک تو تنزل و انحطاط کی انتہا ہو چکی تھی۔"

شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد شاہ صاحب موطا امام مالک کی شرح مسوّیٰ مصفیٰ لکھ کر ایک نئی تحریک کی داغ بیل ڈال دیتے ہیں۔ زمانہ شاہد ہے کہ اس کے بعد پورے عالم اسلام میں ایک لہر پیدا ہو گئی۔ اور آج تک جاری ہے۔

## چوتھا کارنامہ

**ترجمہ قرآن مجید** عوام الناس کے ذہن کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھ سکیں۔ شاہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ عربی کو اب مقام شایان حاصل نہ رہے جو اس کا حق ہے۔ چنانچہ انہوں نے علمائے عصر کے اختلاف کے باوجود ترجمہ قرآن کی ابتدا کر دی۔ غنڈوں نے شہ پا کر مسجد فتحپوری کو قتل کے ارادے سے گھیر لیا۔ لیکن ترجمہ مکمل ہوا اور صرف یہی نہیں بلکہ اصول تفسیر میں فوز الکبیر جیسی معرکتہ الآرا تصنیف یادگار چھوڑی۔ جس میں اصول تفسیر کی ایسی نئی اور دلاویز شاہ راہ کھولی جو شریعت کی روح اور مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے

## پانچواں کارنامہ

**اسلامی نظام سیاست کی نقشہ کشی**۔ شاہ صاحب کا یہ کارنامہ بھی تاریخ کے صفحات کا انمٹ نقش ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام سیاست کی سچی اور صحیح تصویر کھینچی ہے۔ خلافت راشدہ کے سقوط کے بعد جابر حکومتوں کے طویل دور عروج کے باعث مسلمانوں کے ذہن سے صحیح نظام سیاست کا نقشہ محو ہو چکا تھا۔ وہ خلافت علی منہاج النبوۃ اور دوسرے نظام سیاست میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔ شاہ صاحب نے ازالتہ الخفا میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے نہایت عمدہ استدلال سے یہ ثابت کر کے رکھ دیا ہے کہ اصل نظام سیاست خلافت راشدہ کے دور میں پیش کردہ ہی نظام سیاست ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے عین مطابق ہے بقیہ نظام اسلامی نظام سیاست نہیں ہیں۔ خلافت کی حقیقت

اسلام میں نظام حکمرانی حضرت عمر کے اجتہادات و فیصلے کے نظائر یہ سب کچھ ذکر کر کے گویا آیندہ کے لئے نقشۂ کار رکھ دیتے ہیں۔ یہ وہی نقشہ ہے جس کے قیام کی خاطر برصغیر ہند و پاک میں تحریکیں اٹھتی رہی ہیں۔

## چھٹا کارنامہ

**تصوف میں اصلاح** ۔ شاہ صاحب کے زمانے میں تصوف کو جو مقام و مرتبہ حاصل تھا اس سے شاہ صاحب صرف نظر نہیں کر سکتے تھے اور نہ اس کے خلاف کوئی بہت بڑا قدم اٹھا سکتے تھے ۔ اس لئے اس میں صرف اصلاح کی کوشش کی ہے مسلمانوں میں صوفیت کے لوازم میں ایذائے جسمانی اور ہلاکت میں مبتلا کرنے کو داخل سمجھا جاتا تھا۔ برہمچارگی کے اس طریقہ کے خلاف شاہ صاحب نے وصایا میں گفتگو کی ہے اس کو سخت مرض قرار دیا ہے ۔ اور اس کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ بحث وصیت پنجم میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

## ساتواں کارنامہ

**اسلامی نظام حیات کی تدوین** ۔ شاہ صاحب کا سب سے اہم اور اثر آفریں کارنامہ حجۃ اللہ البالغہ، بدور البازغہ، ہے یہ وہ کام ہے جو بڑے دور رس اثرات کا حامل ہے اس کی شہرت بھی پورے عالم اسلام میں ہے۔ دین الٰہی اکبر شاہی کے فتنہ سے متاثر ہو کر اور دور رس نگاہوں سے یہ بات محسوس کر کے کہ آیندہ نظامہائے حیات کا ایک پورا جنگل اوگنے والا ہے۔ جس کا اشارہ شاہ صاحب تفہیمات میں بھی کر رہے ہیں۔ اس بات کا ارادہ کیا کہ اسلام کے متوازن اور عادلانہ نظام کو مربوط شکل میں مدون کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ یہ کام شروع کرتے ہیں۔

مابعد الطبعیاتی مسائل سے بنیادیں اٹھاتے ہیں اور آہستہ آہستہ حکمتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ نہایت حسین انداز میں ایک ایسی عمارت کھڑی کر دیتے ہیں جو اپنے حسن ترتیب اور تناسب

یگانہ روزگار ہے۔ ارتفاقات کے عنوان سے اس دہلوی شیخ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ سب سے زیادہ دل آویز اور متاثر کن ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کا اسلامی نظام حیات کی تدوین کا یہ کارنامہ اتنا عظیم الشان ہے کہ آج تک اس کے اثرات سے عالم اسلامی خالی نہیں ہے۔ اور انشاءاللہ آیندہ صدیوں تک اس کے اثرات زندہ و پائندہ رہیں گے اس کارنامہ کی موجودگی میں اسلام کے اندر کسی جاہلیت کو گھس آنے کا موقع باقی نہیں رہا ہے یہی وہ کارنامہ ہے جس نے عالم اسلام کے مجموعی دین کو ڈھالا ہے تمام عالم اسلام اس کی بدولت احیائے اسلام اور اقامت دین کی تحریکوں سے بھر گیا ہے شاہ صاحب کا صرف یہ ایک کارنامہ ہی انہیں مجدد کے بلند ترین منصب پر رونق افروز کرنے کیلئے کافی ہے۔

# شاہ ولی اللہ دہلوی کا تصور دولت

عبدالوحید صدیقی۔ ایم۔ اے

عالمی مسلم مفکرین میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مقام اس وجہ سے بلند و بالا قرار دیا گیا ہے کہ ان کے فکری نظام سے دین دنیا، شریعت و طریقت مادیت و روحانیت عالم مثال و عالم ناسوت میں کوئی تضاد یا فرق لازم نہیں آتا۔ دراصل یہ کائنات اور اس کے مظاہر، یہ انسان اور اس کے ذہنی افعال کچھ اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کے مختلف حصوں کو الگ الگ نام دے کر انہیں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قدیم مصری، کلدانی، یونانی، چینی اور ہندی مفکرین سے لے کر شاہ ولی اللہ تک انسانی ذہن نے اس کائنات اور خود اپنے آپ کو سمجھنے کے لئے ایک ایسی راہ اختیار کر رکھی تھی جس میں الفاظ اور اصطلاحات اور تقسیم در تقسیم کے ذریعے ہر چیز کو جداگانہ طریقے سے سمجھنے کی کوشش نے "کل" کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور یہ کل بھی ایک ایسا عظیم کل کہ جسے اینٹوں کے ایک ڈھیر سے تشبیہ دینے کی بجائے کسی زندہ جسم سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ جس میں ہر خلیہ دوسرے خلیہ کو متاثر بھی کرتا ہے اور تاثر بھی لیتا ہے جس میں متعدیت اور انفعالیت کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ یہ کوشش اپنی جگہ پر کتنی بھی اہم ہو انسان کو ایک ایسی راہ پر ہرگز گامزن نہیں کر سکتی۔ کہ جس میں حق اور باطل کی تمیز ہو۔ حق اور سچائی ایک بسیط امر ہے

جو کائنات اور ماوراء الکائنات کی اس جامعیت سے ابھرتا ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ نے انتہائی محتاط الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی پوری عمر اور اس میں ہزار عمریں گذرنے کے باوجود ان علمی نتائج تک نہ پہنچتے اگر ان کی تربیت مسلم معاشرہ میں نہ ہوتی یہ اس لئے کہ دین اور دنیا کی تفریق کے خاتمہ کی ذمہ داری بنیادی طور پر قرآن مجید پر عائد ہوتی ہے اور قرآن مجید کا پیدا کردہ معاشرہ انسانی ارتقا کی تکمیل ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر کو قرآن مجید اور اسلامی معاشرہ کا ایک شارح قرار دیا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی سب سے مشہور تصنیف حجتہ اللہ البالغہ کے صرف ابواب اور ان کی ترتیب پر نظر ڈالنے سے یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ آپ کی اس تصنیف کا مقصد مختلف اجزاء کو ایک ایسے کل کی حیثیت سے سمجھنا ہے کہ جس کے بغیر حقیقت کی شناسائی اور حق و باطل کی تمیز ایک ناممکن امر ہے اس ترتیب میں حضرت شاہ صاحب نے سب سے پہلے وہ مباحث رکھے ہیں جن سے انسان کے مکلّف ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس نظریئے کا ابطال ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کی پیدائش کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ منزل یہ مباحث قرآن مجید کی آیت "وما خلقت ھذا باطلا" کی تفسیر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

ان مباحث کو سب سے پہلے رکھنے کی وجہ واضح ہے۔ اگر کائنات اور انسان کی پیدائش بے مقصد ہے تو پھر تلاش حقیقت کے لئے انسان کا سرگرداں ہونا بھی بے کار ہے۔

انسان کی پیدائش کے مقاصد اور اس کے مکلف ہونے کے ثبوت کے بعد یہ سوال ابھرتا ہے کہ انسان کے کون سے اعمال کا نتیجہ خیر و برکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کون سے اعمال کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی کا روپ دھارتا ہے۔ اس سوال کے جواب کے بعد شاہ صاحب نے جمعیت انسانی کے ان ادوار پر نظر ڈالی ہے کہ جن کے ذریعے سے غیر مہذب دور سے لے کر تہذیب اور ترقی

اعلیٰ ترین مقامات تک انسان نے خیر و برکت یا ہلاکت اور بربادی کے اسباب کو اپنایا۔ اس سلسلے میں رسم و رواج اور ارتقائے معاشرہ کے مباحث کو بہت بہت ہی لطیف انداز سے بیان کیا گیا۔

بعد ازاں وہ مباحث زیر غور آئے ہیں جن کا تعلق جمعیت انسانی کی سعادت نیکی اور بدی سے ہے۔ ان اداروں کے بارے میں بحث ہے جن کے ذریعے جم غفیر کو ایسی راہوں پر گامزن کیا جا سکتا ہے جن کا منتج سعادت اور بر ہے۔ اس سلسلے میں نبوت، مذاہب شرائع، مناہج اور سیاسیات کا تذکرہ چھیڑا گیا ہے اور شریعت مصطفوی کو پہلے کی شرائع کا ناسخ ہونے کے اسباب بیان کئے ہیں۔ اخیر میں شریعت مصطفوی میں وارد شدہ احکام کے رموز و اسرار بیان ہوتے ہیں۔ اور ثبوت مہیا کیا جاتا ہے کہ اب ابن آدم کے لئے فلاح و بہبود اور سعادت کا واحد راستہ "اسلام" ہی میں موجود ہے۔

اس طرح تخلیق کائنات اور مقصد تخلیق سے لے کر "اسلامی احکام" کے اسرار و رموز کے بیان تک شاہ صاحب اس "کل" کی پوری پوری تشریح کر جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا "تصورِ دولت" بھی ان ہی مباحث سے ابھرتا ہے۔ اور اس فلسفۂ کل کا ایک ایسا حصہ ہے کہ جسے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ شاہ صاحب کی نظر میں ہر فرد بشر چار چیزوں سے مرکب ہے۔

۱- معدنیات، (۲) نباتات (۳) حیوانات (۴) نفس ناطقہ۔ ان چاروں چیزوں کی ایک خاص امتزاج اور ترتیب سے انسان پیدا ہوتا ہے پہلی تین چیزوں کو ملا کر انسان کا طبعی پہلو کہا جاتا ہے اور نفس ناطقہ کو روحانی پہلو۔ ان دونوں پہلوؤں میں چولی دامن کا ساتھ ہے طبعی پہلو کی بہتری اور ترقی روحانی پہلو کی بہتری اور ترقی کی ضامن ہے۔

اسی طرح روحانی پہلو کی ترقی طبعی پہلو کو متاثر کرتی ہے یہ باہمی تاثر کا نظریہ

اس اشراقی یوگی ویدانتی اور بدھ تصوف کے خلاف ایک اعلانِ جہاد ہے کہ جس کے مطابق انسان کے روحانی پہلو کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ وہ اپنی معدنی ونباتی وحیوانی پہلوؤں کو نظر انداز کر دے۔ یوگ اور ویدانیت کا یہ اندازِ فکر دراصل اس غلط تصور سے پیدا ہوتا ہے کہ جس میں کائنات کا ہر ذرہ دوسرے سے الگ ہے۔ اس میں نہ انفعالیت ہے اور نہ فعالیت اس غلط تصور کے برعکس حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تو صاف فرماتے ہیں کہ:۔

" قوتِ حیوانیہ اور قوتِ ملکیہ میں تضاد فطرت سلیم کے خلاف ہے انسان کے ان دونوں پہلوؤں کے مصالح سے ہی ایک معتدل مزاج پیدا ہوتا ہے"۔

اور سب سے زیادہ اعتدال اس شخص میں پایا جائے گا جس میں دونوں قوتیں بے حد مضبوط ہوں اور دونوں میں مصالحت ہو۔

بالفاظِ دیگر انسان کی صحیح روحانی ترقی صحیح جسمانی ترقی کے بغیر ناممکن ہے۔ اور یہ بھی ایک امرِ مسلم ہے کہ صحیح جسمانی ترقی خوشحالی وفارغ البالی کے بغیر متصور نہیں ہو سکتی۔ اس خوشحالی الترفہ کے متعلق حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ (باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم) حجۃ اللہ

اس سلسلے میں دو نظریئے قائم کئے گئے ہیں جو باہم بالکل متعارض اور متضاد ہیں۔ ایک یہ کہ خوشحالی اچھی چیز ہے۔ اس سے انسان کے مزاج کی اصلاح ہوتی ہے اخلاق میں استقامت پیدا ہوتی ہے معانی ومعارف اور علوم وفنون کی اشاعت ہوتی ہے انسان اپنے ابنائے جنس میں امتیازی درجہ حاصل کر لیتا ہے اور سوءِ تدبیر سے جو جہل اور عجز اور پست ہمتی وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے اس سے نکل جاتا ہے دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خوشحالی قبیح چیز ہے۔ اس سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں باہمی معاملات کی شقتیں، محنت وتعب اور باہمی الجھنوں کی مصیبتیں بھگتنی پڑتی ہیں۔ خوشحالی عالم غیب سے اعراض وغفلت کا سبب بن جاتی ہے۔ اصلاحِ آخرت کی تدابیر سے بالکل غافل اور بے خبر کر دیتی ہے۔ ان دونوں میں

صحیح طریقہ یہ ہے کہ تدابیر پر منافعہ کو باقی رکھا جائے۔ (گودھر دی ص ۲۶۷)

اب جب یہ ثابت ہوگیا کہ خوشحالی ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے انسان کی صحتِ جسمانی و صحت ذہنی وصحت روحانی روبہ ترقی ہوتی ہے۔ مزاج کی اصلاح ہوتی ہے، اخلاق میں استقامت پیدا ہوتی ہے، علوم وفنون کی ترقی ہوتی ہے۔ اور انسان دوسرے حیوانوں سے امتیاز کا درجہ حاصل کرلیتا ہے تو یہ سوالات خود بخود پیدا ہوتے ہیں کہ خوشحالی کس چیز کا نام ہے۔ اس کے حصول کے لئے کیا ذرائع ہیں؟ اور کیا تعیش کی زندگی بھی خوشحالی کی تعریف میں داخل ہے؟

اور کیا ایک انسان کو اس امر کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ اپنی ذاتی خوشحالی کے لئے دوسرے کی ضروریات زندگی تک چھین لے۔؟

اور کیا تمام انسانوں کو خوشحال بنایا جاسکتا ہے؟

ان سوالات کے جواب میں سب سے پہلے خوشحالی کی تعریف کی جاتی ہے۔

## خوشحالی کیا ہے

فرد کی خوشحالی سے مراد یہ ہے کہ اسے وہ اشیاء اور وہ حالات حاصل ہوں جن سے جسمانی و ذہنی و روحانی ترقی ہو۔

وہ اشیاء مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ وہ اشیاء جن کا تعلق فرد کی بقا سے ہو پانی اور غذا اس میں داخل ہیں۔ اور انسانی فرد کی تین بنیادی ضرورتیں ہیں۔ خوراک، لباس اور مکان سب سے پہلے پوری ہونی چاہئیں۔ جس معاشرہ میں لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام نہ ہو اس کے افراد کی اخلاقی حالت گر جاتی ہے اور دماغی اور ذہنی کیفیت پست ہوجاتی ہے۔"

۲۔ وہ اشتہار جن کا تعلق اس امر سے ہے کہ فرد کی جسمانی و نفسیاتی صحت برقرار رہے اور اس کی طبعی عمر میں اضافہ کا باعث بنے نہ تنقیص کا۔ صحت مند ہوا۔ صحت مند غذا۔ صحت مند پانی، موسم کی شدتوں سے بچنے کے لئے مناسب لباس و مسکن۔ صحیح عمرانی تعلقات اس میں داخل ہیں مناسب صحت مند گھر کے بارے میں شاہ صاحب البدور البازغہ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔

ہر شخص کے لئے رہائش گاہ ایسی ہو جس میں سردی اور گرمی سے بچاؤ۔ اور خاندان کے افراد و اسباب کی حفاظت ہو۔ اس کا طول و عرض کشادہ فضا وسیع اور اونچائی متوسط ہو اور یہ اسے آسانی سے میسر ہو۔"

---

# تنقید و تبصرہ

**فیوضات حسینی، المعروف تحفۂ ابراہیمیہ** "تحفۂ ابراہیمیہ" تصوف کے موضوع پر رسالہ ہے، اور اس کے مصنف مشہور عالم دین مولانا حسین علی صاحب مرحوم و مغفور ہیں۔ اصل رسالہ فارسی میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالحمید سواتی مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے کیا ہے شروع میں مترجم نے ایک دو صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔

مولانا عبدالحمید صاحب اس سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کے چند رسالے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر رسالہ تحفۂ ابراہیمیہ کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں انہی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ جن پر شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدین اظہار خیال کر چکے ہیں۔

پہلے ہم اصل رسالے کو لیتے ہیں۔ یہ ان مباحث پر مشتمل ہے:۔

ذکر اور اس کے متعلقات جیسے فضیلت ذکر، طریق ذکر وغیرہ، لطائف خمسہ درود شریف حقیقت توسل و امداد، توجہ شیخ۔ تصور شیخ۔ اور پھر وجود کی بحث۔ آخر میں مصنف نے اپنے آٹھ سلسلہ ہائے طریقت دیئے ہیں۔ اصل رسالہ مع اردو ترجمہ صفحہ ۱۰۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰۴ پر ختم ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم ذکر اور درود شریف کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھے اور انہوں نے اللہ کا ذکر نہ کیا اور حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجا تو یہ مجلس ان کے لئے باعث نقصان وحسرت ہوگی۔ اگر اللہ چاہے تو ان کو سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں :۔ اے برادر! جس طرح اللہ تعالےٰ کے ذکر پر مداومت اور ہمیشگی کرنی ضروری ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی مداومت بھی ضروری ہے۔

مصنف علام نے مسئلہ وجود پر بھی کافی لکھا ہے۔ اور اس میں ان کا مدار علیہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ ہیں۔ آخر الذکر بزرگ کا ارشاد ہے « صوفیہ جہاں یہ کہتے ہیں کہ عالم عین حق ہے۔ تو اس سے وجودات خاصہ کی نفی نہیں کرتے (یہ نہیں کہتے ہیں کہ خارجی اشیار کا وجود ہی نہیں) بلکہ وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ اشیار کا ظہور حق تعالےٰ سے ہے۔ اس کی وضاحت شاہ ولی اللہ صدر الدین قونوی کے اس قول سے کرتے ہیں « یہ وجود منبسط صادر اول ہے۔ ذات الٰہی سے (اور عالم سب کا سب وجود منبسط میں متعین ہے۔ اور شیخ ابن عربی اسی پر اسم حق کے اطلاق کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

قطب غوث، ابدال وغیرہ کی کیا حقیقت ہے؟ مولانا مرحوم نے اس بارے میں لکھا ہے کہ قرآن، حدیث، اور اقوال ائمہ اربعہ میں ان کا ذکر نہیں ملتا، لیکن اگر بعض بندوں پر اللہ تعالےٰ کا کوئی خاص فیضان ہوتا ہے تو اسے کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی واردات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

اور بندہ (مولانا حسین علیؒ) کہتا ہے کہ بہت سے خوابوں میں قطبیت کی بشارتیں میں نے اپنے حق میں دیکھی ہیں۔ خارج میں کچھ معلوم نہیں اور اسی طرح قیومیت کی بشارتیں میں نے دیکھی ہیں اور میرے دوستوں نے بھی میرے حق میں قیومیت کی بشارتیں دیکھی ہیں۔ خارج میں معلوم نہیں۔ اور اسی طرح

بہت سے خوابوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ضمنیت بشارت ہے کہ گویا سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی آغوش رحمت میں ان کو لے لیا ہے۔ اور قبلیت کی بشارتیں دیکھی ہیں لیکن خارج میں اس کے متعلق کچھ علم نہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔۔۔۔"

مولانا حسین علی صاحب مرحوم سے ہمارے ہاں کا وہ طبقہ جو صوفیوں اور پیروں کو مانتا ہے بہت ناراض ہے۔ لیکن زیر نظر رسالہ میں جو کہ خالصاً تصوف پر ہے مولانا مرحوم نے وحدت وجود کی جس طرح بحث فرمائی ہے وہ تو تمام صوفیہ کرام کے نقطہ نظر کے مطابق ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ مشائخ کرام کے نزدیک خارج میں سوائے وجود واحد کے کسی چیز کے لئے تحقق اور ثبوت نہیں ہے اور کثرت جو دکھائی دیتی ہے، یہ کائن کا وہم ہے یعنی وہی وجودِ واحد ہے، جو وجود منبسط آئینہ میں کثرت تجلیات سے متجلی ہوا ہے۔

اس کے بعد مصنّف علّام نے وجود منبسط کے متعلق جو تمام موجودات کے اجسام پہ پھیلا ہوا ہے۔ مشائخ کے اقوال دیئے ہیں اور آخر میں بحث کو شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان پر ختم کیا ہے۔

> "میرے نزدیک حق پہلا مذہب (یہ وجود صادر ہے۔ ذاتِ الٰہیہ سے) ہے۔ کیونکہ وجودات خاصہ کا احکام میں باہم ممتاز ہونا، اور ان مختلف اشیاء کا اپنے مقام پر ثبوت اجلی البدیہات سے ہے۔ پس وہ تنزل جس سے یہ اشیاء کا وجود حاصل ہوتا ہے، لامحالہ یہ مرتبہ ثانیہ میں ہے۔"

لیکن ہوتا یہ ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے آدم بنوری کے طریقے کے بارے میں نقل کیا ہے کہ سالک کو اس قدر استغراق تام ہو جاتا ہے کہ وہ شہود کے غلبہ کے باعث اشیاء کو عین حق پاتا ہے۔

زیر نظر کتاب کا طویل مقدمہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور پر از معلومات بھی۔ اور اس نے اصلی رسالہ کی افادیت اور اہمیت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ شروع میں صاحب رسالہ حضرت مولانا حسین علیؒ کے حالات زندگی ہیں۔ بھچر ولی ضلع میانوالی کے ایک دور افتادہ قصبے کا طالب علم جس کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے تکمیل علم کے لئے ہندوستان کے ممتاز علماء کی خدمت میں پہنچتا ہے۔ اور وہاں سے فارغ ہو کر اپنے قصبہ میں درس و تدریس کی مسند بچھاتا ہے۔ اور تقریباً ساٹھ سال تک طالبان علم کو مستفیض فرماتا ہے۔ پھر درس و تدریس ان کا کسب معاش کا ذریعہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنی زمینداری کی آمدنی طلبہ پر صرف کرتے تھے۔ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور ہل چلانے کھیتی باڑی کرنے اور گھر کے دیگر کام انجام دینے میں کبھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔"

مترجم مولانا سواتی نے مولانا مرحوم کی تصنیفات کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں یہ لکھنے سے باک نہیں کیا کہ آپ کو تصنیف کے فن سے خاص مناسبت نہ تھی۔ اس لئے طرز تحریر اور لکھنے کا کوئی خاص دل نشین ڈھنگ نہیں تاہم جو علمی تحقیقات آپ نے کی ہیں وہ بہت قیمتی ہیں۔"

اسی ضمن میں ایک کتاب "بلغتہ الحیران فی ربط آیات القرآن" کا جو مولانا مرحوم کی املا کرائی ہے۔ ذکر کیا ہے، اور اس میں حضرت زینبؓ کے بارے میں مولانا مرحوم سے جو قول منسوب کیا ہے اس کی تردید کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کتاب کی زبان بہت ناقص ہے۔

مترجم نے مولانا مرحوم کے تلامذہ اور مریدین کے بھی مختصر حالات دیئے ہیں اور بعض پر تنقید بھی کی ہے۔

لکھتے ہیں :۔ حضرت مولانا حسین علیؒ کے بعض منتسبین اپنے مزاجی تشدد کی وجہ سے بعض مسائل میں تشدد کا پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ مولانا مرحوم کے ایک خاص شاگرد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔ بعض مسائل میں آپ کی

تحقیقات اور طرزِ روش فی الجملہ تشدد پسندانہ ہے۔ جس کی وجہ سے تلامذہ کے اذہان پر تیزی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر حدودِ اعتدال کو قائم نہیں رکھ سکتے۔"

مولانا سواتی کو مولانا حسین علی صاحب کے بعض شاگردوں سے یہ شکایت بھی ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو مولانا مرحوم کی طرف منسوب کرتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ مولانا مرحوم کے ایک شاگرد جو ایک ماہنامہ میں تفسیر شائع کر رہے ہیں ان کے بارے میں مترجم نے لکھا ہے۔

"بہت سی باتیں تفسیر میں مولانا غلام اللہ خاں صاحب اور احمد حسین شاہ صاحب (سجاد) نے اپنی طرف سے بیان کی ہیں، جن کا حضرت مولانا حسین علیؒ کی طرف انتساب واقعہ کے خلاف ہوگا"

مولانا سواتی نے مولانا مرحوم کی بعض علمی تحقیقات سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً نماز میں رفع سبابہ کے بارے میں مولانا مرحوم نے جو لکھا ہے مولانا سواتی کے نزدیک وہ تحقیق مرجوح ہے۔ راجح پہلو اس کے خلاف ہے۔

کتاب کے کوئی ۴۰ صفحوں میں رسالہ "تحفۂ ابراہیمیہ" کے مباحث کی وضاحت کی گئی ہے۔ خاص طور سے مسئلہ وحدت الوجود پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اور اس بارے میں مشہور بزرگوں کے اقوال نقل کئے ہیں۔

شمائم امدادیہ سے حضرت حاجی امداد اللہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"عبد و رب میں عینیت اور غیریت دونوں متحقق ہیں وہ ایک وجہ سے اور یہ ایک وجہ سے ..... جاننا چاہیئے کہ عبد و رب میں عینیت حقیقی لغوی کا جو اعتقاد رکھے اور غیریت کا بجمیع وجوہ انکار کرے وہ ملحد و زندیق ہے کیونکہ اس عقیدہ سے عابد و معبود ساجد

و سجود کا کچھ فرق نہیں رہتا۔ اور یہ غیر واقع ہے۔

نعوذ باللہ من ذلک

ہمیں اس سے پہلے مولانا عبدالحمید سواتی صاحب کے بعض تراجم اور دوسری تحریرات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا یہ ترجمہ اور مقدمہ نہ صرف زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بلکہ مطالب کی ترتیب و تشریح کے لحاظ سے بھی ان کی پہلی کتابوں سے کہیں بہتر ہے۔ علماء کرام سے یہ عام شکایت ہے کہ جہاں انہیں اپنے مخصوص علوم میں تبحر ہوتا ہے وہاں وہ تصنیف و تالیف میں خاص دستگاہ نہیں رکھتے۔

مولانا عبدالحمید سواتی نے بہت حد تک یہ شکایت دور کر دی ہے۔ کافی دقیق موضوع پر ہونے کے باوجود اس کتاب کا اسلوب کافی رواں ہے، اور اس کے مطالعہ میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت بڑی اچھی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ اور دیدہ زیب ہے۔

قیمت۔ پانچ روپے

ملنے کا پتہ :۔ (۱) مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر۔ گوجرانوالہ

(۲) شعبۂ نشر و اشاعت انجمن اسلامیہ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

(م ۔ س)

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

اہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت
اشاعت کا انتظام کرنا۔

سلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر
کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے
ے لیے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

ریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے
تابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

اہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لیے علمی مرکز قائم کرنا۔

کمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا

اہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، انہیں فروغ دینے کی
رض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کر

ومسجود کا کچھ فرق نہیں رہتا۔ اور یہ غیر واقع ہے ـــ

نعوذ باللہ من ذلک

ہمیں اس سے پہلے مولانا عبدالحمید سواتی صاحب کے بعض تراجم اور دوسری تحریرات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا یہ ترجمہ اور مقدمہ نہ صرف زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بلکہ مطالب کی ترتیب و تشریح کے لحاظ سے بھی ان کی پہلی کتابوں سے کہیں بہتر ہے۔ علماء کرام سے یہ عام شکایت ہے کہ جہاں انہیں اپنے مخصوص علوم میں تبحر ہوتا ہے وہاں وہ تصنیف و تالیف میں خاص دستگاہ نہیں رکھتے۔

مولانا عبدالحمید سواتی نے بہت حد تک یہ شکایت دور کر دی ہے۔ کافی دقیق موضوع پر ہونے کے باوجود اس کتاب کا اسلوب کافی رواں ہے، اور اس کے مطالعہ میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت بڑی اچھی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ اور دیدہ زیب ہے۔

قیمت۔ پانچ روپے

ملنے کا پتہ :۔ (۱) مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر۔ گوجرانوالہ

(۲) شعبۂ نشر و اشاعت انجمن اسلامیہ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

(م ـ س)

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

ناہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت اشاعت کا انتظام کرنا۔

سلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے۔ اُن پر کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے ے لیے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

ریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے تابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

ناہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لیے علمی مرکز قائم کرنا۔

مت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

لی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ انہیں فروغ دینے کی ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone. 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly **"AR-RAHIM"**
Hyderabad

# المسوّٰی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ——— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ... ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ہر باب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دئیے ہیں۔ [illegible] جلد دو حصوں میں [illegible] قیمت [illegible]

(فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے۔ نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

(عربی)

شاہ ولی اللہ کی فلسفۂ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی [illegible] ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی۔ اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ [illegible] اور وضاحت طلب امور پر نہایت ہی مفید حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو روپے

---

شبیر احمد قریشی منیجر سعید آرٹ پریس نے چھاپا اور محمد [illegible]
شاہ ولی اللہ اکیڈمی، دارہ مسجد صدر حیدرآباد سے شائع [illegible]

جلد نمبر ٦ — اگست ستمبر ١٩٦٨ — شمارہ نمبر ٢ - ٣

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

ماہنامہ

# الرحیم

نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر، حیدر آباد

قیمت سالانہ :۔ آٹھ رُوپے

فی پرچہ :۔ پچھتر پیسے

الرحیم حیدرآباد

جلد ۶ | مورخہ جولائی اگست سنہ ۱۹۶۸ء | نمبر ۲، ۳

# فہرست مضامین

# شذرات

۲۲ راگست کو وطن عزیز کے طول وعرض میں دنیا کے عظیم انقلابی اور مجاہد حضرت علامہ استاذ عبید اللہ سندھیؒ کی برسی منائی گئی۔ آپ کے عقیدتمندوں اور تلامذہ نے مختلف مجالس میں علامہ موصوف کی ولولہ انگیز سوانح حیات اور انقلابی کارناموں پر روشنی ڈالی ملک کے متعدد اخبارات میں مضامین شائع ہوئے لیکن ہماری نظر میں ایک ایسا انسان جسکو قدرت کی طرف سے فطرت سلیم اور فہم عظیم عطا ہو ہو جسکی ساری زندگی ایک تلاش ایک ولولہ ایک عزم لامتناہی اور انتھک جدوجہد میں گذری ہو۔ اور آزادی وطن کے سلسلے میں پچیس برس جلاوطنی کی زندگی بسر کی ایسے عظیم انسان کی حقیقی یاد کی صورت تو یہ ہے کہ ان کے انقلابی افکار اور قرآنی تعلیمات سے آج کے نوجوانوں کو متعارف کرایا جائے اس سلسلے میں سندھ ساگر اکاڈیمی بیت الحکمۃ لاہور اور بیت الحکمۃ کراچی جیسے علمی اداروں نے کافی کام کیا ہے ضرورت ہے کہ اس علمی اور فکری کام کو آگے بڑھایا جائے، اس موقعہ پر ہمیں حضرت علامہ استاد سندھیؒ کے نواسے صاحبزادہ ظہیر الحق صاحب دین پوری نے، مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک غیر مطبوعہ خط کی کاپی بغرض اشاعت ارسال فرمائی تھی، یہ خط مولانا ابوالکلام آزاد نے صاحبزادہ ظہیر الحق کو جیل سے رہائی کے بعد مبارک باد کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا جس سے حضرت الاستاذ عبید اللہ سندھیؒ کی سوانح حیات کے بعض گمنام گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ خط بجنسہ یہ ہے۔

دہلی — عزیز القدر مولوی ظہیر الحق دین پوری سلمہٗ

۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء — السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپنے آزادی پر مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ شکریہ! خط پڑھتے ہی مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آئی اور اس طرح آئی کہ صدائے درد زبان تک پہنچی اور زبان نے نوک قلم کے حوالہ کیا۔ قصہ

بہت طویل ہے اسے مختصر کیا جائے تب بھی وقت سازگاری نہیں کرتا۔ سنہ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے ایام تھے ولی اللہی قافلہ کے امیر حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ نے انتہائی نامساعد حالات میں مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیج دیا۔ ان کو وہاں مختلف ممالک کے سیاسی رہنماؤں سے مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں جرمن، فرانسیسی اور جاپانی سیاست داں چند ایک ایسے بھی تھے جو آج اپنے اپنے ملک میں برسرِ اقتدار ہیں اور عنان حکومت انہی کے ہاتھ میں ہے یہ لوگ اس وقت کے سیاسی رفیق یا مشیر ہیں کہ جب مولانا نے کابل میں حکومت موقتہ قائم کی خود اس کے وزیر ہند منتخب ہوئے اور ریشمی خطوط کی تحریک چلاکر برٹش حکومت کو للکارا اور میدان جنگ میں شکست دے کر اپنا موقف منوایا۔ برطانوی نمائندے نے جنگ کے خاتمہ پر مصالحتی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے حکومت کابل کی خود مختاری کا اعلان کیا ہندوستان کے مطالبہ آزادی کو تسلیم کیا اور بتدریج ہند کو چھوڑ دینے کی وضاحت کر دی۔ اس کا انتقام برٹش حکومت نے امیر امان اللہ خاں سے تو لے لیا مگر مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا کچھ نہ بگاڑ سکی یہ مولانا کا ذاتی سیاسی اثر تھا۔ جس سے وہ مرعوب تھی۔

پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد سنہ۱۹۳۹ء میں جب یہاں پہنچے تو دوسری جنگ کا آغاز تھا۔ انہوں نے اپنی تحریک کانگریس میں پیش کرنے کے لئے میدان ہموار کیا گاندھی جی تک نے اس تحریک کی مخالفت کی اسکے باوجود ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ بادس نے مار دیا اور اسکی گونج بیک تاہم بیالیس سے ٹکرائی۔ یہ سب کچھ مولانا نے باہر بیٹھ کر کیا۔ کسی بھی بحث میں حصہ نہیں لیا۔ اور نہ ہی کبھی کسی اجلاس میں شرکت کی یہ فن صرف وہی جانتے تھے ایک ملاقات میں چلتے پھرتے میں نے ان کے چہرے سے کچھ ایسا تاثر قبول کیا کہ جبکی بنا پر ان سے پوچھ بیٹھا فرمایا کہ چاہتا ہوں سوبھاش اسی وقت باہر چلے جائیں۔ کچھ دیر خاموش ہو کر رخصت ہوئے اور اوکھلا اپنی قیام گاہ پر چلے گئے دوسرے دن اوکھلے سے دہلی کو ملانے والی آٹھ میل لمبی سڑک کے ایک ویران گوشہ میں سوبھاش سے ان کی ملاقات ہوگئی دوسری ملاقات ان کی بالی گنج کلکتہ میں ہوئی اسی ہی ملاقات میں اسے جاپان جانے کے لئے رخصت کیا حکومت جاپان کے نام وزیر ہند حکومت موقتہ کی حیثیت سے اسے ایک تعارفی کارڈ دیا اور وہاں کے فوجی بورڈ کے سربراہ کے نام اپنا ذاتی پیغام۔ سوبھاش کے وہاں پہنچنے پر حکومت جاپان نے فوج میں ان پر اپنے اعتماد کا اعلان کیا ادھر اعلان ہونا تھا کہ ادھر احمد نگر کے قلعہ سے کانگریس ہائی کمان کی رہائی بلاشرط منظور کر لی گئی ورنہ حکومت کا یہ فیصلہ تھا کہ پورے قلعہ کو مع سیاسی قیدیوں کے بم سے اڑا دیا

# شذرات

۲۲ر اگست کو وطن عزیز کے طول و عرض میں دنیا کے عظیم انقلابی اور مجاہد حضرت علامہ استاذ عبیداللہ سندھیؒ کی برسی منائی گئی۔ آپ کے عقیدتمندوں اور تلامذہ نے مختلف مجالس میں علامہ موصوف کی ولولہ انگیز سوانح حیات اور انقلابی کارناموں پر روشنی ڈالی ملک کے مقتدر اخبارات میں مضامین شائع ہوئے لیکن ہماری نظر میں ایک ایسا انسان جسکو قدرت کی طرف سے فطرت سلیم اور فہم عظیم عطا ہوا ہو جسکی ساری زندگی ایک تلاش ایک ولولہ ایک عزم لامتناہی اور انتھک جدوجہد میں گذری ہو۔ اور آزادی وطن کے سلسلے میں پچیس برس جلاوطن کی زندگی بسر کی ایسے عظیم انسان کی حقیقی یاد کی صورت تو یہ ہے کہ ان کے انقلابی افکار اور قرانی تعلیمات سے آج کے نوجوانوں کو متعارف کرایا جائے اس سلسلے میں سندھ ساگر اکاڈیمی بیت الحکمۃ لاہور اور بیت الحکمۃ کراچی جیسے علمی اداروں نے کافی کام کیا تھا ضرورت ہے کہ اس علمی اور فکری کام کو آگے بڑھایا جائے، اس موقعہ پر ہمیں حضرت علامہ استاد سندھیؒ کے نواسے صاحبزادہ ظہیر الحق صاحب دین پوری نے، مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک غیر مطبوعہ خط کی کاپی بغرض اشاعت ارسال فرمائی تھی، یہ خط مولانا ابوالکلام آزاد نے صاحبزادہ ظہیر الحق کو جیل سے رہائی کے بعد مبارک باد کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا جس سے حضرت الاستاذ عبیداللہ سندھیؒ کی سوانح حیات کے بعض گمنام گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ خط بجنسہ یہ ہے۔

دہلی
۱۵ ستمبر ۴۶ء

عزیز القدر مولوی ظہیر الحق دین پوری سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپنے آزادی پر مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ شکریہ! خط پڑھتے ہی مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد آئی اور اس طرح آئی کہ صدائے درد زبان تک پہنچی اور زبان نے نوک قلم کے حوالہ کیا۔ قصہ

بہت طویل ہے اسے مختصر کیا جائے تب بھی وقت سازگاری نہیں کرتا۔ ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے ایام تھے ولی اللہی قافلہ کے امیر حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ نے انتہائی نامساعد حالات میں مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیج دیا۔ ان کو وہاں مختلف ممالک کے سیاسی رہنماؤں سے مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں جرمن، فرانسیسی اور جاپانی سیاست داں چند ایک ایسے بھی تھے جو آج اپنے اپنے ملک میں برسرِ اقتدار ہیں اور عنان حکومت انہی کے ہاتھ میں ہے یہ لوگ اس وقت کے سیاسی رفیق یا مشیر ہیں کہ جب مولانا نے کابل میں حکومت مؤقتہ قائم کی خود اس کے وزیر ہند منتخب ہوئے اور ریشمی خطوط کی تحریک چلا کر برٹش حکومت کو للکارا اور میدان جنگ میں شکست دے کر اپنا موقف منوایا۔ برطانوی نمائندے نے جنگ کے خاتمہ پر مصالحتی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے حکومت کابل کی خود مختاری کا اعلان کیا ہندستان کے مطالبہ آزادی کو تسلیم کیا اور بتدریج ہند کو چھوڑ دینے کی وضاحت کر دی۔ اس کا انتقام برٹش حکومت نے امیر امان اللہ خاں سے تو لے لیا مگر مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا کچھ نہ بگاڑ سکی یہ مولانا کا ذاتی سیاسی اثر تھا۔ جس سے وہ مرعوب تھی۔

پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۹۳۹ء میں جب یہاں پہنچے تو دوسری جنگ کا آغاز تھا۔ انہوں نے اپنی تحریک کانگریس میں پیش کرنے کے لئے میدان ہموار کیا گاندھی جی تک نے اس تحریک کی مخالفت کی اسکے باوجود ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ بادس نے مار دیا اور اسکی گونج بکنگھم پیلس سے ٹکرائی۔ یہ سب کچھ مولانا نے باہر بیٹھ کر کیا۔ کسی بھی بحث میں حصہ نہیں لیا۔ اور نہ ہی کبھی کسی اجلاس میں شرکت کی یہ فن صرف وہی جانتے تھے ایک ملاقات میں چلتے پھرتے میں نے ان کے چہرے سے کچھ ایسا تاثر قبول کیا کہ جبکی بنا پہلے سے پوچھ بیٹھا فرمایا کہ چاہتا ہوں سوبھاش اسی وقت باہر چلے جائیں۔ کچھ دیر خاموش ہو کر رخصت ہوئے اور اوکھلا اپنی قیام گاہ پر چلے گئے دوسرے دن اوکھلے سے دہلی کو ملانے والی آٹھ میل لمبی سڑک کے ایک ویران گوشہ میں سوبھاش سے ان کی ملاقات ہوگئی دوسری ملاقات ان کی بالی گنج کلکتہ میں ہوئی اسی ہی ملاقات میں اسے جاپان جانے کے لئے رخصت کیا حکومت جاپان کے نام وزیر ہند حکومت مؤقتہ کی حیثیت سے اسے ایک شناختی کارڈ دیا اور وہاں کے فوجی بورڈ کے سربراہ کے نام اپنا ذاتی پیغام۔ سوبھاش کے وہاں پہنچنے پر حکومت جاپان نے فوج میں ان پر اپنے اعتماد کا اعلان کیا ادھر اعلان ہوتا تھا کہ ادھر احمد نگر کے قلعہ سے کانگریس ہائی کمان کی رہائی بلا شرط منظور کر لی گئی ورنہ حکومت کا یہ فیصلہ تھا کہ پورے قلعہ کو بمع سیاسی قیدیوں کے بم سے اڑا دیا

جائے ساتھ ہی ہند کی آزادی کا اعلان کر دیا اور ہم آزاد ہو گئے کون جانتا ہے کہ کس کی قربانیاں ہیں؟ جاپانی حکومت نے حضرت مولانا پر اعتماد کیا اس جرم کی سزا اسے ہیروشیما میں بھگتنی پڑی۔ حضرت مولانا کو ایسا زہر دیا کہ جس نے ان کی ہڈیوں سے کھال کھینچ لی۔ پھر ان کی دونوں آنکھیں نکال لیں اور ۲۲ اگست ۱۹۴۵ء کو اس مقام میں پہنچے جو پہلے ہی دن سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اپنے حضور میں مخصوص کر رکھا تھا۔

یدخلهم الجنة عرفها لهم۔

اس وقت آسمان اشک بار تھا۔ زمین رو رہی تھی ہندوستان سوگوار تھا۔ جرمن اور جاپان کا علمی اور سیاسی طبقہ بھی شریک ماتم تھا مگر حکومت برطانیہ نے اس خبر کو افواہ سمجھا تاآنکہ حکم سے وائسرائے ہند کے ذریعہ ایک تحقیقاتی محکمہ قائم ہوا۔ اس نے برطانیہ کے تمام سفارت خانوں سے رابطہ قائم کیا۔ تب کہیں جا کر اطمینان نصیب ہوا اور یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کو پورے ایک سال نو دن بعد سرکاری طور پر اس امر کی تصدیق کی کہ مولانا واقعی فوت ہو گئے ہیں۔

ایک انقلابی کو ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دیں اور پوری دنیا کو دوسرے پلڑے میں تو وہ ایک پوری دنیا پر بوجھل ہوتا ہے۔ اب صرف ایک یاد باقی ہے اور اس یاد کے ساتھ غم۔ غم صرف اس کا نہیں کہ یہ لوگ جدا ہو گئے غم اس کا ہے کہ وہ دنیا ہی مٹ گئی جس دنیا کی یہ مخلوق تھے ہم اس کاروان رفتہ کے پسماندگان رہ گئے ہیں۔ جنہیں نہ تو قافلہ کا سراغ ملتا ہے نہ منزل سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ نہ ہمیں کوئی پہچانتا ہے۔ نہ ہم کسی کے شناسا ہیں۔

فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر (۳)

آزادی صد مبارک ان شہدا کو اور اللہ تعالیٰ کی کروڑوں رحمتیں ان کی تربت پر ہوں۔ میں خیریت سے ہوں الحمد للہ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کریں۔ والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

والسلام ۔ ابوالکلام!

# ترجمۃ القرآن
# شاہ ولی اللہ کی ایک اہم ملی خدمت

سیدہ حنا ایم اے

اسلام میں دوسرے مذاہب کی نسبت اجتماعی عمل کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللہ۔

اور اسی حکمت کے پیش نظر نبی کریم ؐ نے بہ نفس نفیس اپنی نگرانی میں صحابہ کرام کی ایک معتدبہ جماعت ایسی تیار کی تھی جو وفود کی صورت میں مختلف قبیلوں اور علاقوں میں دورہ کر کے لوگوں کو امور دین سمجھاتی اور سکھلاتی تھی۔ یہ اس تربیت کا فیض تھا کہ حضور کے بعد مدینہ دارالعلم بنا۔ کوفے اور بصرے کی خاک سے فقہا اور محدثین کی ایک کثیر تعداد اٹھی اور بلاد اسلامیہ میں پھیل گئی۔ مدرسہ اہل حجاز یا مدرسہ اہل مدینہ سے امت مسلمہ کو امام مالک جیسا امام اور موطا جیسی احادیث نبوی کی کتاب ملی۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے۔

> "تابعین کے بعد امام مالک بندوں کے لئے اللہ کی سب سے بڑی حجت ہیں جب کوئی حدیث مالک کی روایت سے تم کو پہنچے تو اسکو مضبوطی سے پکڑ و کیونکہ وہ علم حدیث کا ایک درخشاں ستارہ ہیں۔"

موطا امام مالک کا ایسا کارنامہ ہے جس سے رہتی دنیا تک امت مسلمہ رہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ ادھر کوفے کے مکتب فکر نے امام ابوحنیفہ جیسا بلند پایہ عالم پیدا کیا جس کے مرتب کئے

ہوئے اصول فقہ تا قیامت مسلمانان عالم کے لئے فکر و نظر کے اسباب مہیا کرتے رہیں گے۔ آپ نے امت مسلمہ کو اجتہاد جیسی نعمت عطا کی۔ فرماتے تھے۔ ابراہیم شعبی۔ ابن سیرین عطاء اور سعید بن جبیر نے بھی اپنے زمانے میں اجتہاد کیا۔

پس میں بھی اجتہاد کرتا ہوں ۲ے

اس طرح آپ نے قوم کو تقلید جامد سے بچا کر اس پر غور و فکر اور ترقی و تکمیل کی نئی نئی راہیں کھولدیں۔

کسی تحریک کو کامیاب بنانے اور اسے دور تک چلانے کے لئے شخص سے زیادہ جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مصلحت کے پیش نظر ایسا بندوبست کیا گیا کہ ہر دور اور ہر زمانے میں مسلمان علماء کی ایک جماعت احکام شریعت کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف رہے۔ حضور نبی کریم کے زمانے میں بالغ نظر اصحاب کی تعداد اتنی تسلی بخش تھی کہ ختم نبوت کا اعلان کر دیا گیا۔ اور علماء کو انبیاء کرام کا وارث قرار دیا گیا۔ جیسا حضور کا ارشاد ہے۔

ان العلماء ورثۃ الانبیاء

یعنی اس وقت ایک ایسی جماعت تیار ہو چکی تھی۔ اور جماعت سازی کا کام ایسے خطوط پر ہونے لگا تھا کہ اس کے ذریعہ منصب نبوت کی تکمیل بہ آسانی ہو سکتی تھی۔ حضور نبی کریم کے بعد جو چار مکاتیب فکر قائم ہوئے وہ بھی انہیں خطوط پر کام کر رہے تھے جن پر حضور کے زمانے میں کام ہو چکا تھا۔ ان چاروں سر برآوردہ ائمہ نے اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی ایسی معتنبہ جماعتیں تیار کر دی تھیں جو ان کے خیالات و افکار کو انہیں خطوط پر آگے بڑھا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقلدین آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں امام ابو حنیفہ کو نہ صرف ان کے فقہی افکارات اور وسیع النظری کی وجہ سے بلکہ ان کے عظیم اور باعمل تلامذہ کے باعث بھی خصوصیت حاصل ہے اور ہمیشہ رہے گی

---

لے فلسفہ شریعت اسلام صہ ۴۹ تا ۵۱

۲ے فلسفہ شریعت اسلام صہ ۳۷۔ ۳۸

اس برصغیر میں یہ شرف امام الہند شاہ ولی اللہ کو حاصل ہے کہ تلامذہ اور عقیدتمندوں کے علاوہ خود آپ کے خانوادے میں محض آپکے فیض تربیت اور توجہ سے عرصۂ دراز تک ایسے عالم پیدا ہوتے رہے جنہوں نے آپ کی تحریک کو ملک گیر بنانے میں بڑا نمایاں کام انجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاگرد سیرت وکردار کا صرف ایک رخ دیکھتے ہیں اور استاد کی صرف علمی استعداد سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ لیکن گھر کے لوگوں کے سامنے پوری شخصیت ہوتی ہے۔ ان کے سامنے علمی استعداد کے علاوہ عملی زندگی بھی ہوتی ہے اور وہ اس جذبے کی گہرائی اور گیرائی سے شاگردوں کی نسبت زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعہ جو تشریح وتفسیر سامنے آتی ہے وہ اصلیت سے زیادہ نزدیک ہوتی ہے اور اس میں وہ جذبہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے جو کسی تحریک کے بانی کے سینہ میں موجزن ہوتا ہے اس لئے جب گھر کے افراد اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ زیادہ موثر زیادہ مقبول اور زیادہ ہمہ گیر ہوکر پھیلتی ہے۔ اور یہ شاہ صاحب کی انتہائی خوش بختی تھی کہ ان کی تحریک ان کے بعد انہیں کے بیٹے پوتوں کے ہاتھوں بڑھی پھلی پھولی اور پروان چڑھی ورنہ عوام الناس میں تو ولی کے گھر بھوت کی مثل مشہور ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ کی طرح ان کا خانوادہ بھی اس نمایاں خصوصیت کا حامل ہے کہ وہاں ولی کے گھر ولی ہی پیدا ہوئے۔

شاہ صاحب کا زمانہ فتنہ وشر جہالت وگمراہی کا زمانہ تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ علم دین ایک خاص طبقے میں محدود ہوکر رہ گیا تھا اور اپنی طرف سے جو لوگ عوام کے رہنما بن بیٹھے تھے وہ عموماً نیم خواندہ مولوی اور ملا تھے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کی شہادت ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

> مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم وبدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقیر اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق اور حکمت کے ہنگاموں سے پرشور

نقہ اور فتاویٰ کی لفظی پرستش پر نفقی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق وتدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی ومطالب احادیث کے احکام وارشادات اور فقہ کے اسرار ومصالح سے بے خبر تھے۔ ۱ء

اور مولانا مسعود عالم ندوی رقمطراز ہیں۔

خواص یعنی اہل درس ومسند کا حال اور برا تھا۔ صاف صاف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے پر موقع ایسا آ پڑا ہے کہ بے کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ نام نہاد صوفیا اور نقرا فقر کی بساط بچھا کر سادہ لوح مسلمانوں کے مال اور ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں مدرسوں میں ابھی تک ارسطو کی سڑی ہوئی لاش پر عمل جراحی جاری ہے شمس بازغہ اور قاضی مبارک کی دھوم ہے۔ قرآن کریم اور حدیث کی کانوں میں بھنک پڑ جائے تو خیر حرج نہیں لیکن ان کی تحصیل میں عمر عزیز کے کچھ حصے ضائع کئے جائیں یہ ناممکن ہے۔ ۲ء

اور جو لوگ قرآن وحدیث کی تحصیل میں عمر عزیز کے کچھ حصے صرف بھی کرتے تھے ان کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں۔

پہلے علماء کا یہ دستور تھا کہ قرآن شریف حفظ تلاوت کرنے کے لئے پڑھاتے تھے اور مطالب سکھانے کے لئے جس فن سے انہیں دلچسپی ہوتی تھی اس قسم کی ایک تفسیر طالب علم کو پڑھا دیتے جس سے قرآن شریف گویا اس فن کی ایک اعلیٰ کتاب بن جاتی تھی۔ اور جو اخلاقی ذہنیت استاد کی طبیعت میں مرکوز ہوتی۔ تفسیر پڑھنے سے اور راسخ ہو جاتی۔ ۳ء

---

۱ء معارف نمبر ۵ جلد ۲۲۔ ۲ء الفرقان بریلی ولی اللہ نمبر ص ۳۹

۳ء الفرقان بریلی ص ۲۸

فتح الرحمٰن کی تفسیر میں خود شاہ صاحب نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں

> اب تک قرآن مجید کے مطالب سمجھنا صرف عربی تفاسیر پر منحصر تھا جسے علماء اپنا ہی حصّہ سمجھ بیٹھے تھے اور عوام کلام الٰہی کا منشا اور فطرۃ اللّٰہ کا مفہوم سمجھنے سے محروم اور بے نصیب تھے طوطے کی طرح قرآن مجید پڑھتے تھے۔[۱]

ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ قرآن کریم کا ترجمہ ملکی زبان میں عام فہم انداز سے کیا جاتا کیونکہ دین اسلام کا سب سے بڑا اور پہلا ماخذ قرآن کریم ہی ہے چنانچہ ہر مسلمان تک خدا کا پیغام براہِ راست اور بالتصریح پہنچانا بے حد ضروری تھا تاکہ بندوں کا رشتہ براہِ راست خدا سے استوار ہو سکے ان حقائق کے پیش نظر اللہ کے بعض مخلص بندوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ زمانۂ حال کی تحقیقات سے ایسے کئی تراجم کا پتہ چلا ہے جن میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید شریف جرجانی اور مخدوم نوح ہالائی کے تراجم قابل ذکر ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ تراجم مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر رواج نہ پا سکے اور عوام تک نہ پہنچ سکے۔

۱۔ پہلی اور قابل ذکر وجہ طباعت اور اشاعت کی مجبوری

۲۔ عام جہالت اور ناخواندگی

۳۔ کٹ ملاؤں کی مخالفت

۴۔ عوام میں اندھا دھند تقلید کرنے کا جذبہ

ان کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ایسی تمام کوششیں انفرادی اور غیر منظم تھیں انہیں ایسے لوگ میسر نہ آسکے جو اس کام کو آگے بڑھاتے۔ وقت کے تیور پہچانتے اور بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتے۔ وقت کا اہم تقاضا تھا کہ کوئی ایسا مردِ مجاہد پیدا ہو جو ملک و ملت میں حالات کے مطابق معقول اصلاح کر کے ان کی خرابیاں دور کرے چنانچہ مشیت

---

[۱] تفسیر فتح الرحمٰن

باری میں شاہ صاحب کو اس کام کے لئے چنا گیا۔ امام حسن حسینؓ نے اپنے نانا کا قلم سپرد کیا اور خود حضورؐ کی روح مبارک نے نمودار ہو کر چادر اڑھائی۔ اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھی۔ اور تو خود باری تعالیٰ کی جانب سے انکو فاتحیت کا خلعت عطا ہوا[1] اور آپ سے ایسے امور ظہور میں آئے جن کے نتائج دور رس اور دیرپا ثابت ہوئے۔

آپ کی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو دین اسلام کی کامل تصویر اور قرآن کریم کی مکمل تفسیر ہے لیکن کیونکہ یہ عربی میں تھی اور عوام کی دسترس سے بالا۔ اس لئے آپ نے اس زمانہ کی مروجہ فارسی زبان میں قرآن کریم کا مختصر جامع اور عام فہم ترجمہ کیا۔ جس سے عام لوگوں کو کلام الہٰی کا سمجھنا آسان ہو گیا۔

اس ترجمہ کا اس زمانے کے خواندہ طبقہ کی جانب سے خاطر خواہ خیر مقدم کیا گیا اگرچہ اس زمانے کے قدامت پسند علماء آپکی اس جسارت پر برہم بھی ہوئے چنانچہ پروفیسر فری لینڈ ایبوٹ۔ اپنی تصنیف سلطنت مغلیہ کا زوال اور شاہ ولی اللہ میں لکھتے ہیں۔

> شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہندوستان میں اس وقت بہت کم مسلمان عربی جانتے تھے لیکن فارسی ان کے اونچے طبقے کی زبان تھی۔ ان کے اس اقدام سے بہت سے قدامت پسند علماء ناراض ہوئے۔ وہ کلام اللہ میں کسی قسم کی تبدیلی کے خواہ وہ ترجمہ ہی کیوں نہ ہو عقیدۃً خلاف تھے۔"[2]

حیات ولی کے حاشیہ میں شاہ صاحب کے سفر عرب کے سلسلہ میں یہ واقعہ بالتفصیل درج ہے کہ جب شاہ صاحبؒ نے فارسی میں قرآن حکیم کا ترجمہ کیا اور اسکی اشاعت ہوئی تو کٹ ملاؤں میں ایک عظیم تہلکہ برپا ہو گیا اور ایک مرتبہ بعد نماز عصر انہوں نے شہر کے غنڈوں کو لے کر حملہ کر دیا۔ وہ شاہ صاحب کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ جب شاہ صاحب

---

[1] حیات ولی ص ۸۹ م

[2] الرحیم مئی ۱۹۶۴ء ص ۶۹

نے ان سے اپنا جرم معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ تونے قرآن کا ترجمہ کرکے بالکل عوام الناس کی نظروں میں ہماری وقعت کو کھو دیا ہے دن بدن ہماری روزی میں خلل پڑتا جاتا ہے اور ہمارے معتقد کم ہوتے جاتے ہیں اور یہ ہمارے ہی لئے نہیں بلکہ ہماری آیندہ نسلوں کے لئے بھی سخت نقصان دہ ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے جواب دیا۔ تم خدا کی نعمت خاص کرنی چاہتے تھے میں نے عام کردی"۔ بہرحال شاہ صاحب کو خدا نے ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ لیکن شاہ صاحب نے اس سلسلے میں سفر عرب اختیار کیا"۔[۱]

ہمارے خیال میں یہ روایت بچند وجوہ محل نظر ہے۔

اوّل تو یہ کہ شاہ صاحب کو مخالفت میں اتنا تشدد نہیں برتا جا سکتا کیونکہ شاہ صاحب ایک مشہور اور معزز خاندان کے صاحب حیثیت اور صاحب اثر فرد تھے آپ پر اس طرح کھلے بندوں ہاتھ ڈالنا آسان بات نہ تھی دوسرے یہ کہ بڑے سے بڑا اکٹ ملا بھی واشگاف الفاظ میں یہ اعتراف نہیں کر سکتا کہ اس طرح اس کی روزی میں خلل پڑے گا یا اسکی وقعت کم ہو جائے گی۔ جو لوگ انسانی نفسیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اپنی کمزوری کے اعتراف کے لئے بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ایسی جرأت وہ لوگ کبھی نہیں کر سکتے جو اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ ہو چکے ہوں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ انہوں نے مخالفت کے لئے عربی زبان کے تقدس کو آڑ بنایا ہو۔ بدعت کفر اور الحاد کے فتوے لگائے ہوں۔ اور اس قسم کے دلائل دیئے ہوں جیسے اہل مصر نے اس وقت دیئے تھے جب وزارتِ مصریہ نے اعلان کیا تھا کہ قرآن کریم کا ترجمہ سرکاری طور پر مختلف زبانوں میں کیا جائے۔ تاکہ تعلیمات اسلامیہ کی اشاعت ہو سکے اس وقت مخالف پارٹیوں کی جانب سے اس تجویز کی مخالفت میں مندرجہ ذیل دلائل دیئے گئے۔

۱۔ عربی اسلام اور اہل اسلام کا شعار ہے قرآن کریم الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے بس ترجمہ کرنیکی صورت میں یہ تعریف باقی نہیں رہتی۔

---

[۱] حیات ولی حاشیہ ص ۱۸۔۱۴۹

۲۔ ترجمہ کرنے سے زبان اور وطن پر مضرت رساں اثرات پڑتے ہیں

۳۔ قرآن کریم میں جو روحانیت اور نور ہے اس کا ترجمہ ممکن ہی نہیں بلکہ ترجمہ اسے زائل کر دیتا ہے۔" [۳۲]

ا عجب یہ ہے کہ ایسے ہی دلائل اس وقت ہندوستان کی مخالف پارٹیوں نے بھی دیئے ہوں گے اس کے علاوہ تیسری قابل غور بات یہ ہے کہ راوی نے اسی مخالفت اور شورش کو شاہ صاحب کے سفر حجاز کا سبب قرار دیا ہے جب کہ ........ ........ شاہ صاحب نے سفر حجاز ۱۱۴۳ھ کے آخر میں اختیار فرمایا۔ اور ۱۱۴۵ھ میں واپس تشریف لائے۔ اور فتح الرحمٰن کی بیاض ۱۱۵۰ھ میں ختم ہوئی اور ۱۱۵۲ھ میں اسکی اشاعت ہوئی۔ یعنی یہ واقعہ سفر حجاز سے تقریباً پانچ چھ سال بعد کا ہے نہ کہ پہلے کا۔ [۳۳]

بہر حال مخالفت ہوئی ضرور جیسا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی فرماتے ہیں آپنے (شاہ صاحب نے) قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تاکہ اس کا افادہ عام ہو سکے آپ کا یہ اقدام غیر معمولی عمل تجدید تھا۔ جس نے عام علماء میں ان کی خود غرضی کی بناء پر بے چینی پیدا کر دی تھی [۳۴]

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ فتح الرحمٰن لکھنے کے جرم میں نجف خاں نے شاہ صاحبؒ کے پہنچے اتروا دیئے تھے۔ لیکن اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یہ محض افواہ ہے اور درحقیقت ایسا نہ ہوا تھا اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ خود شاہ صاحب یا آپ کے عظیم المرتبت صاحبزادوں کی تحریروں سے اس افواہ کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ شاہ صاحب کی مکمل زندگی تاریخ کی روشنی میں

---

[۳۲] فلسفہ شریعت اسلام ص ۱۶۱-۱۶۲

[۳۳] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۲۰۲-۴

[۳۴] الفرقان، ولی اللہ نمبر ص ۳۲۹

ہے اور اس کا ہر پہلو نہایت واضح ہے ان کے سوانح نگار ان کو زندگی کے آخری لمحات تک نہایت مقبول۔ معزز اور فعال حیثیت میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ اگر درحقیقت ایسا ہوا ہوتا تو تاریخ کی پیشانی پر ایک شکن تو ضرور پڑ جاتی۔ اس واقعہ کے خلاف شہری شہادت تاریخ کی ہے یعنی نجف خاں پہلی مرتبہ بادشاہ شاہ عالم کے ساتھ ۱۷۷۲ء میں دہلی آتا ہے اور دہلی میں اس کا اقتدار اس تاریخ کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس تاریخ سے پورے دس سال قبل یعنی ۱۷۶۲ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے [۱]

ان حقائق کی روشنی میں ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ محض افواہ ہے جس میں صداقت کو کوئی دخل نہیں ہے۔

تاہم یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس زمانے میں معاشرے کی زوال پذیری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ظاہری نمود و نمائش اور غیر اسلامی رسوم و رواج کا دور دورہ تھا۔ وصایائے اربعہ کے مقدمے میں مقالات الشعراء کے حوالے سے لکھا ہے کہ

مذہبی بدحالی حد بیان سے باہر ہے توہم پرستی۔ مراسم پرستی اور عملی زندگی کے مزار اس دور کی نمایاں علامات تھیں جاہل صوفی اور خوش عقیدہ مولوی عوام کے مقتدا بنے بیٹھے تھے۔ اندھی تقلید نے معاشرے کا جنازہ نکال دیا تھا جاہل پیر اور صوفی لوٹ مچائے ہوئے تھے [۲]

اس سلسلے میں شاہ صاحب کو ایک فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی علمی اور دینی صلاحیتیں بجائے شاہی درباروں اور حلقۂ مریدان با صفا کے لئے وقف کرنے کے عوام کے لئے وقف کیں۔ جدید دنیا نے آج صدیوں بعد عوام کی اہمیت کو سمجھا ہے جب کہ شاہ صاحب کی بالغ نظری نے بہت پہلے اس اہمیت کا احساس اور اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا۔

---

[۱] مجموعہ اربعہ وصایا ص ۱۸　　[۲] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۳۱ - ص ۲۰۲

چنانچہ حرمین شریفین میں ۱۴ ماہ قیام کے بعد واپس ہونے پر آپ نے مسلمانوں کی گذری ہوئی عظمت کے احیاء کا کام شروع کیا اور اس سلسلہ کی پہلی کڑی آپ کا قرآن کریم کا فارسی ترجمہ اور اس کی شرح تھی اور اس عصر میں کیونکہ عوامی زبان فارسی تھی۔ اور آپ کا تعلق براہ راست عوام سے تھا اس لئے قرآن فارسی کا ترجمہ نہ صرف بامحل بلکہ ناگزیر تھا ہی نہیں بلکہ آپ کے بعد آپکے صاحبزادوں نے اس تعلق کو زیادہ استوار کیا۔ شاہ عبدالعزیز کے دور میں فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تھی اس لئے آپ کے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا نیز آپ کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل شہید نے کئی دینی کتب اردو میں تصنیف کیں کیونکہ یہ تحریک فی اصلہ ایک عوامی تحریک تھی۔ اور یقیناً پیغام بھی عوام سے متعلق تھا۔ چنانچہ اس کی ابتدائی تیاریاں اسی انداز پر کی گئیں

ایک دوسرے موقعہ پر پروفیسر جلبانی فیوض الحرمین اور تفہیمات کے حوالے سے فرماتے ہیں۔ شاہ صاحب سفر حرمین سے دہلی واپس آئے تو لوگوں کو قرآن پاک کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی۔ اور پرانے بوسیدہ نظام کو توڑنے کا نعرہ بلند کیا۔ [1]

اور وہ پرانا نظام کیا تھا۔ اندھی تقلید۔ خوش عقیدہ مولویوں اور نام نہاد صوفیاء کی لوٹ کھسوٹ جس کا نشانہ نیم خواندگی اور عربی سے ناواقفیت کے باعث براہ راست عوام تھے شاہ صاحب جادۂ حق کی طرف صحیح معنوں میں انکی رہنمائی کی قرآن کریم کا سادہ اور عام فہم ترجمہ اس وقت عوام کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور یہ بالکل فطری اثر تھا۔ ہر جگہ ہر زمانے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اپنی الہامی کتب کا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں اس موضوع پر علامہ اقبال نے اپنے چھٹے خطبہ میں ترکی کے ایک عوامی شاعر

---

[1] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص۴۲

ضیاء کی نظم کا حوالہ دیکر بڑے اچھے پیرائے میں بحث کی ہے۔ ضیا کہتا ہے۔

> وہ سرزمین جہاں ترکی میں اذان دی جاتی ہے جہاں نمازی اپنے مذہب کو جانتے اور سمجھتے ہیں جہاں قرآن کی تلاوت ترکی زبان میں کی جاتی ہے جہاں ہر چھوٹا بڑا احکام الٰہیہ سے واقف ہے۔ اے فرزند ترکی وہ ہے تیرا آبائی وطن۔

شاعر کے اس تخیل پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں اگر مذہب کا مقصد فی الواقعہ یہ ہے کہ انسان کا دل روحانیت سے بھر دے تو ضروری ہے کہ وہ یعنی مذہب اس کے رگ وپے میں سرایت کر جائے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ جب تک اس کے یعنی مذہب کے روحانیت خیز افکار مادری زبان میں ادا نہیں کئے جاتے ایسا ہونا ناممکن ہے علامہ اسے شاعر کا ایک قابل اعتراض اجتہاد قرار دیتے ہیں۔ مگر فوراً ہی موحدین کے دور حکومت سے اسکی تائید میں ایک مثال پیش کر دیتے ہیں۔ جب محمد مہدی ابن تومرت نے حکم دیا تھا کہ چونکہ بربر ایک ناخواندہ قوم ہیں لہذا ان کی خاطر قرآن مجید کا ترجمہ اور تلاوت بربری زبان میں دی جائے حتیٰ کہ علماء　　اور فقہا بھی اس کی تعمیل کریں۔[۲]

بہر حال یہ ایک علیحدہ بحث ہے اور ظاہر ہے سخت مضرت رساں بھی کیونکہ اگر عربی کو فارسی ترکی اور دوسری زبانوں سے بدلنے کا عمل شروع ہو جاتا تو کلام الٰہی کا محفوظ رہنا شک وشبہ میں پڑ جاتا ہاں ترجمہ کی حد تک یہ اجتہاد ہرگز اعتراض نہیں کیونکہ مذہب کو دور مذہبی احکامات کو جاننے اور سمجھنے کی آرزو انسانی فطرت ہے اور پھر اسلام تو دین فطرت ہے اس مذہب میں جس قدر اہتمام و تفہیم پر زور دیا گیا ہے غالباً کسی اور مذہب میں نہیں دیا گیا۔ علم۔ اور شعور کے الفاظ اور ان کے مختلف صیغے کلام پاک میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اور ظاہر آیات قرآنی کے مخاطب

---

[۱] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص۲۴

[۲] تشکیل جدید الہیات ص ۲۴۸ - ۲۴۹

عام لوگ تھے جب قرآن کریم ان کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ حق طرح طرح کے دلائل و براہین سے ان کے ذہن نشین کرے تو دوسرے ممالک میں بسنے والے پیروان اسلام کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کا پیغام براہِ راست اور پوری طرح سمجھیں اور سمجھ کر اسکے احکامات پر عمل کریں۔ عوام کے اس حق کی تائید خود قرآن پاک اور احادیث نبوی سے بھی ہوتی ہے۔ سورہ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے۔

تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ لیکون للعالمین نذیراہ

(ترجمہ) برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ڈرانے والا ہو جائے۔

اس آیت کریمہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی دعوت صرف عرب کیلئے مخصوص نہیں پھر شرح بخاری میں ہمیں نبی کریم کی یہ حدیث بھی ملتی ہے۔

بعثت الی الناس عامۃ

یعنی میں سب انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

پھر صحابہ کرام کے عمل سے بھی عوام کے اس حق کی تائید ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اہل عجم کے لئے حضرت سلمان فارسی سورہ فاتحہ کا فارسی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اس پر قیاس کر کے امام ابو حنیفہ نے اس شخص کے لئے جو عربی سے بے بہرہ ہو فارسی اور ہر زبان میں نماز جائز قرار دی ہے۔ اگرچہ فضیلت عربی کو ہی حاصل ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اس اجتہاد سے کام لے کر عوام کی گردنوں سے نام نہاد پیروں اور مولویوں کا جوا اتارا۔ اور ان کو اس کا موقع فراہم کیا کہ وہ براہِ راست قرآن و حدیث سے اپنا رشتہ جوڑیں۔ فرمایا جو شخص محض امی اور ان پڑھ ہے اس کے لئے تقلید جائز ہے اور جو شخص پڑھا لکھا ہے وہ اگر کسی خاص شخص کی تقلید نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں [1]

---

[1] حیات ولی ص

مولانا محمد عبداللہ عمر پوری لکھتے ہیں۔ سرزمین پاک و ہند میں شاہ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اور اپنے مجوزہ نصاب تعلیم میں قرآن مجید کا ترجمہ لازمی قرار دیا۔ دراصل ان کے پیش نظر یہ تھا کہ تعلیم کے ابتدائی مرحلے ہی میں طالب علم کا قرآن کریم سے براہ راست تعلق ہو جائے۔ اور وہ ہر شعبۂ علم میں۔ روایت میں بھی اور درایت میں بھی قرآن ہی کو اپنی بنیاد بنائے۔ اور ہر مسئلہ میں سب سے پہلے اسی کی توجہ قرآن کی طرف مبذول ہو اور اس سے حل ڈھونڈے[1]

شاہ صاحب کے اس اقدام کو کیا اہمیت تھی مولانا مناظر احسن گیلانی سے سنئے فرماتے ہیں

سچ پوچھئے تو اغلاط اور ناقدری کے اس زمانے میں ہمارے مولویوں کے لئے بھی قرآن و حدیث کے یہ تراجم آج اکسیر کا کام دے رہے ہیں عربی مدارس میں ٹوٹی پھوٹی ہمتوں والے طلبا آج جو کچھ پڑھتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ ان میں بہت کم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو بغیر ترجمہ کی مدد کے قرآن یا حدیث کا پورا مطلب خود سمجھ سکتے ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ زبان سے ناواقف ہونیکی وجہ سے اللہ کے بندے اپنے مالک کے براہ راست مخاطب بننے کی سعادت سے محروم تھے۔ درحقیقت جو منافع ان تراجم کے پڑھنے سے پڑھنے والوں کو حاصل ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں وہ مولوی کی زبان سے سن کر کبھی حاصل نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ترجمہ پڑھنے والے عوام میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے انہیں ترجموں کی مزاولت سے آہستہ آہستہ عربی زبان سے ایسا لگاؤ پیدا کر لیا کہ براہ راست خود کلام اللہ انکی سمجھ میں آرہا ہے خلاصہ یہ کہ شاہ صاحبؒ کے کارناموں میں ترجمہ کی خدمت کو سب سے بڑی خدمت قرار دیتا ہوں[2]

---

[1] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۲۹

[2] تذکرہ شاہ ولی اللہ ص ۲۵۴ - ۲۵۸

اور مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں۔

ہندوستان میں قرآن فہمی کا یہ چرچا آج جو کچھ نظر آرہا ہے اور یہ اردو۔ انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمہ شائع ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں یا آئندہ ہوں گے ان سب کے اجر کا جزو اعظم یقیناً شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائے گا۔ یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوئے۔ اگر اس کی ابتدا آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے نہ کر جاتے تو نہ شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ وجود میں آتا نہ شاہ عبدالقادر کا اور متاخرین کا تو ذکر ہی کیا۔ جو شخص امت کی بے شمار نسلوں کے لئے اتنی بڑی رحمت کا دروازہ کھول گیا اس کے اجر بے حساب کا حساب اور مرفہ بے نہایت کا اندازہ کون کر سکتا ہے[1]

اور مولوی عبدالرحیم۔ حیات ولی میں دعوے سے فرماتے ہیں ۔۔۔۔

اگر آپ کا وجود نہ ہوتا تو ہندوپاک میں جو علمی نیا منیاں اسوقت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ہرگز نظر نہ آتیں بلکہ خاص خاص محدود حلقوں میں دیکھی جاتیں[2]

شاہ صاحب کے زمانے کے فوراً بعد کیونکہ فارسی کی جگہ اردو نے لینا شروع کر دی تھی۔اس لئے عظیم باپ کے تربیت یافتہ عظیم بیٹے نے وقت کے تیور پہچان کر قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا۔ اور اس طرح شاہ صاحب کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔ یہ بات کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کو ترجمہ کرنیکا خیال اپنے والد کے ترجمہ ہی کی بنیاد پر ہوا۔ موضح القرآن میں اسکے متعلق شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

بندے عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب حضرت بڑے شیخ ولی اللہ عبدالرحیم کے بیٹے۔ سب حدیثیں جاننے والے

---

[1] الفرقان ولی اللہ نمبر ص۱۳

[2] حیات ولی ص ۶۳۹

ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی میں قرآن کے معنی آسان کرکے لکھے
اس طرح اس عاجز نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنی لکھے[1]

شاہ عبدالقادر کے اس ترجمے کے متعلق رحیم بخش صاحب فرماتے ہیں۔

قرآن مجید کا سلیس اور ٹھیٹ اردو میں ترجمہ جس خوش اسلوبی اور انوکھے پیرائے میں آپ نے کیا ہے اظہر من الشمس ہے۔ دیکھنے میں نہایت سہل اور مختصر لیکن دقیق اور باریک مطالب سے لبریز۔ قرآن مجید کے ادنیٰ اور غامض مسئلوں کو ایسے سہل طریقے سے بیان کرنا کہ عالم وجاہل یکساں متمتع ہو سکیں تائیدِ غیبی نہیں تو اور کیا ہے۔"[2]

عوامی زبان میں کلام پاک کے ترجمہ کا پہلا اثر یہ پڑا کہ عوام نمازوں اور تلاوت میں جو الفاظ ادا کرتے تھے ان کے مفہوم سے آشنا ہوئے لاعلمی کے باعث سر آستانوں پر سر جھکانے والوں نے جب دن میں پانچ مرتبہ دہرائی جانے والی آیۃ کریمہ ایاک نعبد وایاک نستعین کے معنی پڑھے تو ایک لمحے کے لئے سوچ میں ضرور پڑ گئے۔ قول وعمل کا تضاد ابھر کر سامنے آیا اور بہت سی سعید روحیں جو محض لاعلمی کی بنا پر اس تضاد کا شکار ہو رہی تھیں خود تائب ہو کر دوسروں کی اصلاح میں مصروف ہوئیں۔ آیۃ نحن اقرب علیہ من حبل الورید۔ اور ادعونی استجب لکم ۔ جیسے لطیف اور دل گرمانے والے جملوں نے خدا اور بندے کے رشتہ کو استوار کیا۔ شاہ صاحب کے ذریعہ خدا کی نعمت عوام کے لئے عام ہو گی۔
شاہ صاحب اور شاہ رفیع الدین کا عمل بارش کے پہلے قطرے جیسا تھا۔ پھر تو باران رحمت موسلا دھار برسا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل کا سا عالم ہو گیا۔ اس وقت دنیا کی تقریباً ہر زبان میں کلام پاک کا ترجمہ موجود ہے۔ اور اس وقت ہند وپاک میں جہاں سے جہاں تک سچے اسلام کی روشنی نظر آتی ہے اور شرک وبدعت سے صاف اور ستھرا ہوا مذہب دکھائی دیتا ہے سب اسی ترجمہ کا صدقہ ہے۔[3]

---

[1] حیات ولی ص ۱۶۱ [2] موضح القرآن [3] حیات ولی ص ۶۳۹

کچھ تفسیر کے بارے میں۔

تفسیر ترجمے کا ایک لازمی جزو ہے اور شاہ صاحب کے زمانے میں تفسیر کا معاملہ ترجمے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ علمار کرام نے ایک ایک آیۃ کریمہ کی تفسیر وتشریح میں ایسی ایسی علمی موشگافیاں کی تھیں اور ان کو اس قدر طول دیا تھا۔ مخصوص صلاحیت رکھنے والے افراد کے علاوہ عام لوگوں کے لئے ان کا پڑھنا اور سمجھنا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ تفسیر میں طوالت سے قطع نظر اسرائیلی روایات کی بھرمار نے قرآن کریم کے بعض حکیمانہ کلمات کو قصہ کہانی کی شکل دیدی تھی۔ اور ہر آیت کے ساتھ شان نزول کے التزام نے عمومی اور مطلق احکامات کو مخصوص اور مقید کر دیا تھا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

> عام مفسرین ہر آیت ما از آیاتِ مخاصمہ و آیاتِ احکام قصہ مربوط سازند و آں قصہ را سبب نزول انگارند وایں را چنداں دخل نیست[1]

مفسرین کی اس روش کا عوام پر جو اثر پڑا وہ مولانا عبیداللہ سندھی کے الفاظ میں سنئے فرماتے ہیں۔

> درحقیقت قرآن کریم کو آیات احکام تک محدود کرنے اور ان آیات کو عمومی مطالب کے بجائے جزوی واقعات کے ساتھ مخصوص کرنے کا یہ اثر ہوا کہ قرآن بہ حیثیت مجموعی زندگی میں موثر نہیں ہوا۔[2]

شاہ صاحب نے ان قباحتوں کو سمجھا اور الفوز الکبیر لکھ کر ایک بہت دشوار مسئلے کو آسان تر بنادیا۔ آپ نے قرآن کریم میں بیان شدہ تمام عوارف ومعارف کو پانچ اقسام کے علوم میں تقسیم کر کے فن تفسیر نویسی میں ایک جدید باب وا کیا۔

> انہوں نے فن تفسیر کو اسرائیلیات سے پاک کیا شان نزول کو عمومیت بخشی اور بڑی جرائت اور حق گوئی کے ساتھ واضح کر دیا کہ منافقین مشرکین اور گنہگار صرف اس زمانے میں نہیں تھے بلکہ ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

(۱) الفوز الکبیر ص۳ ۔ (۲) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۳۷

"صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقرار سے معلوم ہوتا ہے کہ نزلت فی کذا۔ محض اس واقعہ کے لئے نہیں ہے جو عہد نبوی میں ہوا اور نزولِ آیت کا سبب بن گیا۔ بلکہ اس پر بھی بولتے ہیں جس پر یہ آیت صادق آ رہی ہو۔ خواہ وہ واقعہ عہد نبوی میں ہو یا بعد کو" ۳

مثلاً سورہ مدثر کی گیارھویں سے پچیسویں آیت تک قرآن کریم میں سرمایہ پرستوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ جسے علماء کرام نے شان نزول میں حضورؐ کے زمانے کے ایک سرمایہ دار ولید بن مغیرہ سے خاص کر دیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

چاہیئے کہ ان آیات کو ہر زمانے پر چسپاں کر کے دیکھا جائے اور ہر شخص اپنی ذہنیت کا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ وہ کہاں تک اس سرمایہ پرستی کی ذہنیت میں مبتلا ہے۔ ۵

یوں انہوں نے عامتہ الناس کو اپنے اعمال و افکار کے تجزیئے کا ایک موقع فراہم کیا۔ مولوی رحیم بخش الفوز الکبیر کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

سخت حیرت ہوتی ہے کہ اصول تفسیر کے عمیق اور گہرے دریا کو اس مختصر کوزے میں کس طرح بند کیا گیا ہے۔ اصول تفسیر کے وہ اہم اور پیچیدہ مباحث جو بڑی بڑی کتابوں میں بمشکل حل ہو سکتے تھے شاہ صاحب نے اس مختصر اور سہل عبارت میں طے کر دیئے ہیں جس سے کم استعداد طالبہ بھی خاطر خواہ متمتع ہو سکتے ہیں۔ اور معتد بہ فائدہ

---

۱ے الفوز الکبیر ص۳

۲ے شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۳۷ - ۳۸

۳ے الفوز الکبیر سبب نزول

۴ے شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص۲۸

۵ے حیات ولی ص۵۲۵ - ۵۴۹

اٹھا سکتے ہیں اس مختصر رسالے نے بڑی بڑی تفاسیر کے دیکھنے اور
اور برسوں کے مطالعہ سے شائقین کو مستغنی کر دیا۔ اور مولانا
سندھی کا سر شوریدہ بھی الفوزالکبیر کے ذریعہ ہی بایں آسائش
تک پہنچا۔ فرماتے ہیں جب سندھ پہنچا تو مجھے الفوزالکبیر کا نسخہ ملا۔
اس سے پیشتر میں امام رازی کی تفسیر کا مطالعہ کر کے کافی پریشان
ہو چکا تھا۔ فوز کبیر کی فصل اول کا مطالعہ کرنے کے بعد میں مطمئن
ہو گیا کہ انشاءاللہ علم تفسیر سمجھ میں آ سکتی ہے۔ پھر اس دن سے
اب تک میں ان کے۔ یعنی شاہ صاحب کے مسلک سے باہر جانیکی
ضرورت محسوس نہیں کر سکا۔[1]

اور سید ابوالحسن ندوی فرماتے ہیں۔

اس کی الفوزالکبیر کی۔ قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو تفسیری مشکلات
سے واسطہ پڑا ہو۔ بعض اصول جو انہوں نے شاہ صاحب نے اپنے
ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بناء پر لکھ دیئے ہیں دوسری کتابوں کے
سیکڑوں صفحات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔[2]

اس کی اس اہمیت کا اندازہ خود شاہ صاحب کو بھی تھا فوز کبیر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

میگوید فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم چوں برایں فقیر درے از
فہم کتاب اللہ کشادند خواست کہ بعضے نکات نافعہ کہ در تدبر
کلام اللہ یاراں را بکار آید در رسالہ مختصرے مضبوط نماید امیدوارے
از عنایت حضرت ربی آنست کہ طالب علماں را بہ مجرد فہم ایں
قواعد راہے واسع در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ گردد کہ اگر عمرے

---

[1] الفرقان ص۲۲۸

[2] الفرقان ص۲۱۱

در مطالعہ تفاسیرے گنر انیدن آنہا بہ مفسران علی انھم اقل
قلیل فی ہذالزماں بسر برند بآں ضبط و ربط بدست نیارند۔
غرض قرآن مجید کے جملہ مطالب کا اجمالی تعارف کرانے کے لیے
شاہ صاحب نے الفوز الکبیر لکھی اور فتح الخبیر تصنیف فرماکر
تفسیر بالرائے کے بجائے تفسیر بالروایت کی طرف متوجہ کیا[1]

خلاصہ یہ کہ شاہ صاحب اور ان کے والد کو زمانے میں فقہا اور مفسرین نے عوام مسلمانوں کی روزمرہ زندگی سے قرآنی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی خارج کر دیا تھا لہذا ضرورت تھی کہ قرآن مجید کو عامۃ المسلمین کے ذہنوں کے قریب لایا جاتا تاکہ انکی تربیت قرآن کے اصولوں پر ہوسکتی آپ کے زمانے میں مسلمانوں کے ذہنوں کے قریب لایا جاتا تاکہ ان کی تربیت قرآن کے اصولوں پر ہوسکتی۔ آپ کے زمانے میں مسلمانوں کی رسمی زبان فارسی تھی۔ آپ نے قرآن کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قابل فہم بنانے کی خاطر اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اور اس پر تشریحی فوائد لکھے۔

قرآن مجید ہی کے سلسلہ میں شاہ صاحب کا ایک بہت بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سوسائٹی کو جس کے لیے بلاغت کے ذریعہ قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ بتایا کہ قرآن کا معجزہ ہونا فصاحت و بلاغت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ جو نظام حیات وہ پیش کرتا ہے وہ اس کا اعجاز ہے گویا شاہ صاحب نے قرآن مجید کی علمی افادیت کو اس کا معجزہ ہونا ثابت کیا جب کہ اب قرآن کے اس نظام حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی یا عجمی۔ عامی ہو یا عالم۔ فلسفی ہو یا سادہ مزاج مستفید ہو سکتا اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا تو اس صورت میں معدودے چند افراد کے علاوہ دوسرے لوگ اسکی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔ اور انہوں نے قرآن عظیم کے مطالب کو اس شکل میں پیش

---

[1] مولانا محمد عبداللہ عمر پوری الرحیم ستمبر ۶۳ء ص ۹۴

کرنے پر صرف اکتفا ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے صحبت یافتہ لوگوں میں سے اس طریقے پر سوچنے والی ایک جماعت بھی پیدا کر دی [1]

الفوز الکبیر میں جامع اور مختصر تفسیر تھی۔ اس کے بعد اس کی روشنی میں اور انہیں خطوط پر چلکر شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا ......

... اور شبیر احمد عثمانی نے اردو میں عام فہم اور مختصر تفاسیر لکھیں۔ جن کی بدولت آج ایک معمولی نوشت و خواند کی صلاحیت رکھنے والا انسان بھی شریعت الٰہی کو سمجھ سکتا ہے اور اس کی روشنی میں ایک بہتر زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر سکتا ہے۔

شاہ صاحب حقیقی معنوں میں حکیم الامت تھے۔ انہوں نے مسلم معاشرے کی ذہنی اصلاح یکر ایسا مواد مہیا کیا جس سے نہ صرف علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا بلکہ مسلم معاشرے میں اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اور لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ انہوں نے جمود کو توڑا عمل کی دعوت دی قرآن و حدیث کو عام کیا فقہ کی حیثیت معین کی۔ عقائد کو واضح کیا اور مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی۔

بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔

آج ہندوستان میں علم دین کا چرچا۔ مذہبی بیداری اور شرک و بدعت سے اجتناب اور علماء کا وقار جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب شاہ صاحب کے فنی مجددانہ کارناموں کا اثر مابعد ہے [2]

اور یہ واقعہ ہے کہ اگر شاہ صاحب قرآن و حدیث کے تراجم کی بنیاد ڈال کر نہ چلے جاتے تو اس وقت بھی قرآن عربی زبان میں ہونے کی وجہ عوام کی دسترس سے باہر ہوتا ان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں قرآن و حدیث کے ترجمے کی بنیاد ڈالی۔

---

[1] عبیداللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ ایک اجمالی تعارف الرحیم جون ۱۹۶۳ء صـ۹ - ۱۷

[2] الفرقان ولی اللہ نمبر صـ ۳۲۹

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

# مکتوبات، علمی و ادبی تبرکات

مرتبہ:- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

## مکتوب شاہ عبدالعزیز - کسی عزیز کے نام

اما بعد المرسوم بین الاحیاء من التحیة والدعاء فقد طالعت رقیمتکم الابنقة التی صدر نحونا باسم خواجہ محمد امین و دستموهانی غلاف دیوان الحزین واطلعت ما فیها من المضامین المتنوعة وکان من جملتها الاستفسار و الاستکشاف عما تقرر من احتالی الاقامة والارتحال

بعد سلام و دعا کے واضح ہو کہ میں نے آپ کے اس مکتوب گرامی کا مطالعہ کیا جو خواجہ محمد امین کے نام تھا اور جس کو دیوان حزیں کے غلاف میں آپ نے رکھا تھا۔ میں نے اس کے تمام مندرجہ مضامین پڑھے اس میں میری اقامت اور سفر کے بارے میں بھی سوال تھا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ فقیر بھی آج کل میں جانے کا قصد کر رہا ہے میری والدہ اور بھائی مجھے یہاں تنہا

فاعلموا أنّ الفقير ايضاً
عنداً او بعد غدٍ قاصد و
ذلك لانّ الوالدة والاخوة
لايدعونني انْ اُقيمَ
ههنا منفرداً۔
..... تعب السفر الذي
يجئ في الاجتماع اولیٰ من
لذةِ الاقامة التي في الانفراد
فقبلتُ منهم ذلك وقد
تقرر التوجه الی البدهانه
بالفعل ثم ان طلعت شموس
الفتن من المشرق اوالمغرب
نرتحل من هنالك الی
الموضع المعلوم اسمهُ
وان سكنت رياحها الجنوبية
والشمالية اخترنا العود الی
هذا البلد المألوف ۔ عمّرة الله
عمّره الله — واما
طلبُ الكتبِ المرقومةِ
فالقول الفصل فيها
انها سُدّت في الغرائرِ
لايطاق اِخراجها الآن
وما بلغها ان شاء الله تعالیٰ

چھوڑنے پر راضی نہیں ہیں ۔
میں نے بھی سفر کی اس شقت کو جو
سب کے ساتھ ہو اپنی انفرادی اقامت
کی راحت پر ترجیح دے کر ان کے
فیصلے کو قبول کر لیا۔ اب بالفعل
بڈھانہ کی سکونت طے پائی ہے۔ پھر
اگر مشرق یا مغرب سے فتنے نمودار
ہوئے تو ہم وہاں سے ایک اور مقام
پر چلے جائیں گے۔ جو ذہن میں ہے
اگر جنوبی اور شمالی فتنے دب گئے تو
پھر ہم اسی بلد مالوف (دہلی) کی طرف
لوٹنا پسند کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اسکو
آباد رکھے۔

اور آپ نے جو مجھ سے چند
کتابیں طلب کی ہیں اس کے بارے
میں صحیح بات یہ ہے کہ تمام کتابیں
باندھ کر (بعدیوں) وغیرہ میں رکھدی
گئی ہیں۔ اس وقت ان کا نکالنا بہت
مشکل ہے کسی جگہ استقرار نصیب ہونے پر

بعد الاستقرار فی موضع ... واما رسالۃ الجمع بین وحدتی الوجود والشہود فہو مکتوب سیدنا الوالد قدس سرہٗ ۔ الی آفندی اسمٰعیل الرومی ولقبہ بالمکتوب المدنی وکذلک مقدمۃ ازالۃ الخفا مسدودۃ فی الغرائر واما دیوان الحزین فقد طالعت بعضہ من ذروۃ النہار الی ھذا الوقت وارسلتہٗ علی یدی حامل الرقیمۃ ۔ والسّلام

انشاءاللہ تعالےٰ ان کتابوں کو جلد بھیجدوں گا ۔ اور رسالہ وحدت الوجود والشہود جو دراصل والد صاحب قدس سرہٗ کا آفندی اسمٰعیل رومی کے نام ایک مکتوب ہے، جسے مکتوب مدنی کا نام دیا گیا ہے ۔ نیز ازالۃ الخفا کا مقدمہ یہ دونوں بھی دیگر کتابوں کے ساتھ بند ہیں ۔ آپ نے جو دیوان حزیں کا نسخہ بھیجا تھا اس کا بعض حصہ آج دیکھ لیا ہے ۔ حامل رقعہ کے ہاتھ اسکو واپس کر رہا ہوں ۔

والسلام

---

## مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ ۔ بعض افاضل کے نام

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ ۔ وبعد ۔ فقد طال انتظار شرح الجغمنیۃ الی الآن ولم یصل بعدُ ۔ فکانہٗ لم تیفق لاھل الفلھت ارسالہٗ فند اشتغل بہ الشیخ رفیع الدین

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ شرح چغمنی کا انتظار بہت طویل ہوگیا ۔ ابھی تک یہ کتاب نہیں پہونچی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل پھلت اس کتاب کو بھیجنے کا موقع نہیں پاسکے یہ کتاب برادر عزیز شیخ رفیع الدین سلمہٗ کے کام میں ہے صرف ایک ہی نسخہ ہے

سلمہٗ ربہٗ والنسخۃ منفردۃ علیھا یعتمد فی الصحۃ والسقم ومع ذلک فھی سقیمۃ فی الغالب فالواجب ان یبلغ اقصی الجھد فی الطلب فان اتفق فبھا والا، فالیاس احدی الراحتین

والسلام

جس پر صحیح اور غلط کا دارومدار ہے پھر وہ بھی اکثر غلط ہے آپ اچھی طرح کوشش کرکے دوسرا نسخہ تلاش کریں اگر مل جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ ناامیدی بھی ایک قسم کی راحت ہے۔

والسلام

---

# مکتوب شاہ عبدالعزیزؒ بعض فاضل کے نام

اما بعد السلام المسنون فقد وصلت صحیفتکم الشریفۃ محتویۃ علی عافیتکم و عافیۃ اھل بیتکم فشکرنا اللہ علی ذلک۔ وان سألتم عنا فنحن ایضاً بحمد اللہ بعافیۃ ورفاھیۃ غیر ان ماجری فینا من تقدیرات اللہ تعالی رحلۃ المولد العزیز احمد واختلال الانتظام المنزلی۔ الخ

بعد سلام مسنون۔ آپ کا گرامی نامہ ملا جو آپ کی اور آپ کے متعلقین کی عافیت پر مشتمل تھا اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے — اور ہماری حالت دریافت طلب ہو تو ہم بحمد اللہ عافیت و رفاہیت سے ہیں۔ البتہ تقدیرات الہیہ کا ظہور میاں احمد کے انتقال اور انتظام منزلی کے اختلال کی شکل میں ہوا۔ الخ

---

اس مکتوب سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک صاحبزادے کا نام احمد تھا۔

# مکتوب شاہ عبدالعزیز بنام شاہ نور اللہ (خسر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ)

..... فمّما شاعَ وذاعَ وملاءَ
السماع وتواتر بل وقع علیه
الاجماع، نهوض موکب
الدرانی الی تسخیر هذه البلاد
والارباعِ وإنّ مقدمةَ جیشهٖ
عبرت النهر او کادت وشوکتهُ
اللتی فارقتهُ قد عادت و
انهٗ بنفسهٖ وصلَ الی جلال آباد
وحصل من رؤساء الافاغنة لهٗ

وہ بات جو بہت شائع، مشہور اور
گوش زد خاص و عام ہو رہی ہے
بلکہ تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ یہ ہے
کہ لشکر احمد شاہؒ درانی اٹھ کھڑا ہوا
ہے یہاں کے شہروں اور علاقوں
کو مسخر کرنے کے لئے۔ اس کے
مقدمۃ الجیش نے نہر کو عبور کر لیا ہے یا
عبور کیا چاہتا ہے، اور اس کی وہ پہلی
شوکت جو اس سے جاتی رہی تھی اب
پھر لوٹ آئی ہے اور وہ بنفس نفیس
جلال آباد... تک پہنچ گیا ہے۔
افغان رؤساء اس کے

---

عـہ جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ درانی تین مرتبہ ہندوستان میں اپنا لشکر لے کر آئے۔ جن میں ایک مرتبہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حیات میں اور دو مرتبہ انکے بعد ان دو میں ایک حملہ ۱۷۶۷ء میں کیا اس وقت یہ مشہور ہوگیا تھا کہ درانی کا مقصد اس حملے سے انگریزوں کو بنگال سے نکالنا ہے چنانچہ انگریزوں نے بھی ایک دستہ الہ آباد بھیج دیا تھا کہ اودھ ہی میں مقابلہ ہو جائے اس کے بعد ۱۷۶۹ء میں آخری بار سکھوں سے نبرد آزما ہوئے اس مکتوب میں ان آخری دو حملوں میں سے کسی ایک کا ذکر ہے۔ اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پانی پت کے بعد درمیان میں درانی کی شوکت میں کچھ خلل آگیا تھا۔ بعد کو یہ خلل دور ہوا۔

الانقیادُ ھذا ھوالخبر
المحقق المنقح بحسب الظن
والذی سار فی الاطراف
کالمثل السائر۔ والعلم
عندالعلیم الخبیر۔
واما کفار مرھٹہ فہم
علیٰ ما کانوا علیہ من السکون
جامدون فی خیم الادبار
ومعسکر الخسران۔

تابع فرمان ہو گئے ہیں۔ یہ خبر
بحسب الظن اور شہرت کے لحاظ سے
محقق اور منقح ہے۔ باقی اصل علم
خدائے علیم وخبیر ہی کو ہے۔
گروہ مرہٹہ اسی حال میں ہے جس حال
پر تھا، یعنی سکون وجمود میں مبتلا ہے
اور ادبار وخسران کے خیموں میں
سکونت پذیر ہے۔

---

# مکتوب شاہ اہل اللہ بنام شاہ عبدالعزیزؒ

یا من ھو عزیزٌ عندالقلوب
ویا من فضلہ بالعلم علامُ
الغیوب۔ نسال اللہ لنا و
لکم ان ینجینا وایاکم من
من شرور الزمان خصوصاً
من غلبۃ اھل الطغیان فی
البلدان وقد وصل الینا
مکتوبکم المرغوبُ واطلعنا
علیٰ ما فی مطویاتہ من
تلاقی الفئتین ومصاف الفرقتین
فئۃٌ تقاتل فی سبیل اللہ

اے وہ کہ جو سب کے دلوں کو عزیز
ہے اور جسکو علام الغیوب نے علم کے
ساتھ فضیلت بخشی ہے ہم اللہ تعالیٰ
سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہم کو
اور تم کو شرور زمانہ سے محفوظ رکھے۔
خصوصاً اس فتنے سے جو اہل طغیان کے
غلبے کی صورت میں شہروں میں رونما
ہے تمہارا مکتوب مرغوب پہونچا۔ اور
اس کے مندرجات سے آگاہی ہوئی۔
اس میں دو گروہوں اور جماعتوں کی
نبرد آزمائی کا بھی ذکر ہے۔

واخری کافرة یرونهم
مثلیهم رأی العین والمرجو
من فضل الله سبحانه ان
ینصر المسلمین ویخذل
الکافرین ... فکم من فئة
قلیلة غلبت فئة کثیرة
باذن الله - والذی یسمع
من اخبار جنود لشجاع الدولة
من کفار فرنگ فالی الله
المشتکی - الا یا ایام الفتن
والحوادث ونحن فقراء المسلمین مثل

ایک جماعت فی سبیل اللہ قتال کرنے
والوں کی ہے اور دوسری مخالفین
اسلام کی جن کی تعداد دیکھنے میں دوگنی
نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے
امید ہے کہ وہ مسلمین کو کامیاب اور
ان سے مقابلہ کرنے والوں کو ناکام
کرے گا۔ کتنی کچھ کم تعداد کی جماعتیں
ایسی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے
بڑی تعداد والی جماعتوں پر غالب آئیں
اور وہ خبر جو کفار فرنگ انگریزوں کے
ہاتھوں شجاع الدولہ[۵] کے لشکر کی شکست سے

---

۵ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہندوستان میں انگریزوں نے اپنی سلطنت کی گویا بنیاد رکھ دی تھی۔ کلکتہ پر تو انگریز پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے اس کے بعد انہوں نے پٹنہ پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ میر قاسم نے بھاگ کر اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی پھر شجاع الدولہ میر قاسم اور مغل بادشاہ شاہ عالم ان تینوں نے مل کر پٹنہ پر حملہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی پھر یہ تینوں دوسری مرتبہ ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے میدان میں جمع ہوئے انگریز فوج لے کر مقابلہ کے لئے آیا۔ بڑی بھاری جنگ ہوئی جس میں شجاع الدولہ وغیرہ کو شکست ہوئی شاہ عالم نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ شجاع الدولہ دوبارہ کچھ دنوں بعد اپنی فوج جمع کر کے مقابلے کے لئے نکلے پھر شکست ہوئی اور انگریزوں سے معافی مانگی۔ اس مکتوب میں غالباً بکسر کی شکست کا ذکر ہے۔ جس کا سال ہجری ۱۱۷۸ھ ہے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات سے دو سال بعد ہوئی تھی۔ اور ممکن ہے کہ بکسر کے بعد والی جنگ کا ذکر ہو جس میں شجاع الدولہ کا لشکر نبرد آزما ہوا تھا اور جو بکسر سے تھوڑے عرصے بعد ہوئی تھی۔

حشرات الارض من اتی علیها
یدسها بالاقدام لا نستطیع
الانتقال والارتحال من بلدٍ
الی بلدٍ واین المفر لاملجأ ولا
منجأ من الله الا الی الله - کان
ما کان - لکن الوقعة التی فیها
اخبار السکهان اوحشنا غایة
الوحشة - فان شرورهم
اجدر ان یخاف منها لقربهم
وهجومهم بغتة کما وقع
مراراً وعدوانهم شدیدة
یفعلون بهم مالا یفعلون
بغیرهم - خصوصاً من
کان معروفاً فی العلم
والمشیخة اعاذنا الله وجمیع
المسلمین من شرورهم و
خبث صدورهم -

والسلام

متعلق سنی جارہی ہے - اس سے
صدمہ ہے - بس اللہ ہی سے ہماری فریاد
ہے یہ زمانہ حوادث کا زمانہ ہے - اور ہم
فقراء مسلمین بے وقعتی میں حشرات
الارض کی مانند ہو رہے ہیں کہ جو آتا ہے
ہم کو پامال کر جاتا ہے - ہم نہ کہیں
جا سکتے ہیں نہ کسی جگہ منتقل ہو سکتے ہیں
اور بھاگنے کی جگہ بھی کہاں ہے ؟
کوئی ملجاء اور نجات کا ٹھکانہ اللہ سے
بچ کر نہیں - بس اسی کی طرف رجوع
کرنے میں نجات ہے - یہ واقعہ تو ہوا سو ہوا
تمہارے اس خط نے جس میں سکھوں سے
متعلق لکھا تھا بہت زیادہ فکر میں ڈال دیا
ان کے شرور سے خوف ہونا ہی چاہیئے اس
لئے کہ یہ قریب کے ہیں اور ان کا ہجوم
اچانک ہوتا ہے جیسا کہ کئی مرتبہ ہو چکا
ہے اور اس وقت ان کی دشمنی بھی دوسروں
کی بہ نسبت اہل اسلام سے شدید قسم کی ہے
خصوصاً ان حضرات سے جو علم و مشیخت
میں معروف و ممتاز ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ
ہم کو اور جمیع مسلمین کو ان کے شرور
اور خبث صدور سے محفوظ رکھے -

والسلام

# مکتوب شاہ اہل اللہؒ بنام شاہ عبدالعزیزؒ

۱۔ یا من لدیّ اہل الصفا ما
فیک مقبولٌ ثم الذی یاتیک
من فضلٍ فما مولٌ۔

۱۔ اے وہ کہ اہل صفا کے نزدیک تمہارے اندرون کی خوبیاں مقبول و پسندیدہ ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ تم پر فضل الٰہی سایہ فگن ہوگا۔

۲۔ ان السعادۃ کلہا فی کلّکم
مشہودۃٌ والخیر فی اصلابکم
واللہ مجبولٌ۔

۲۔ سعادت کلیتہً تم سب میں ظاہر اور روشن ہے۔ اور خیر تو خدا کی قسم تمہارے خاندان کی سرشت میں ہے

۳۔ یاتی من الاخبار ما یدھش
قلوبنا فالحفظ من کان
من الآفات مسئولٌ

۳۔ خبریں اس قسم کی آرہی ہیں جس سے قلوب خوف زدہ ہیں۔ آفات سے حفاظت کی درخواست اللہ تعالیٰ سے کی جارہی ہے۔

۴۔ اللہ یحفظنا وایاکم من البلاء
فی الدین والدنیا فبعض الخلق
مبتولٌ۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم سب کو بلاؤں سے محفوظ رکھے، دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔ بعض مخلوق بہت ہی پریشان اور تباہ حال ہے۔

---

ع؎ یہ منظوم مکتوب غالباً شاہ عبدالعزیزؒ کے اس منظوم خط کے جواب میں ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ایامُ بردٍ اتت والقلب منجزع
من قوم سکھ وان الخوف معقول

اور جو حیات ولی کے ص ۳۳۳ و ۳۳۴ پر درج ہے۔

# مکتوب شاہ عبدالعزیز بنام مولانا رشید الدین خاں دہلوی

خان صاحب عالی مراتب جامع
الفنون والفضائل سلالۃ العلماء
والافاضل مرضی السجایا والشمائل
سلمہ اللہ وابقاہ والی معارج
اکمال الدارین رقاہ۔
اما بعد اہداء السلام المسنون
واتحاف الدعاء الذی ھو بالاخلاص
معجون وبکمال المودۃ مشحون
فقد وصلت رقیمتکم الکریمۃ و
دلت علی عافیتکم من جمیع
الوجوہ وکانت لداء الانتظار
تمیمۃ وان سألتم عن حالی
فلا استطیع شرحہا خوفاً
من ملالۃ الاصدقاء وکآبۃ
الاحباء اما مرض القدیم
فقد اشتد جداً لاسیما
قصور البصارۃ وہیجان العین
فان ذلک منع من اکثر اشغالی
والی اللہ المشتکی وھو المستعان۔

خاں صاحب عالی مراتب جامع الفنون
والفضائل ۔۔۔ کو اللہ تعالے سلامت
رکھے اور کمالات دارین کی بلندیوں پر
فائز کرے۔ بعد سلام مسنون اور ایسی
دعا کے بعد جو اخلاص سے مرکب اور
کمال محبت سے بھری ہوئی ہے۔
واضح ہو کہ تمہارا مکتوب آیا اور اس نے
تمہاری ہر طرح کی عافیت سے مطلع
کیا۔ یہ مکتوب مرض انتظار کے لئے تعویذ
ثابت ہوا۔ اب اگر تم مجھ سے میرا حال
دریافت کرتے ہو تو بھائی میں اپنی داستان
کو مفصل بیان کرنے سے قاصر ہوں۔
ڈرتا ہوں کہ کہیں طول تحریر دوستوں
کی الجھن اور تکلیف کا باعث نہ بن جائے
مختصر یہ ہے کہ جو بیماری پہلے سے چلی
آرہی تھی اس نے اب شدت اختیار کر
لی ہے۔ بالخصوص ضعف بصارت اور
آشوب چشم نے مجھے اشغال سے روک
دیا۔ بس اللہ ہی سے فریاد کرتا ہوں اور
وہی ایسی ذات ہے جس سے مدد طلب
کی جاتی ہے۔

# ایک استفتاء کا جواب

ایک سید صاحب نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ایک مکتوب استفتاء کی شکل میں بھیجا تھا۔ اس کا جواب مع ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جواب کا کچھ حصہ آخر سے حذف کر دیا گیا ہے جس سے اصل مطلب و مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ استفسار کرنے والے یہ سید صاحب کون ہیں؟ بیاض سے ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ جواب استفتاء کے آغاز میں ان کو حضرت شاہ صاحب نے ان الفاظ سے مخاطب فرمایا ہے "سید صاحب عالی مراتب جامع الفضائل والمناقب الشدید فی دین اللہ کا لیف القاضب الخ۔"

---

بعد السلام والتحیۃ المنونۃ رقیمہ کریمہ شرف ورود دریافت حمد الٰہی بجا آوردہ شد کہ دریں زمانہ ہم حمیتِ دینی درمیان اکابر موجود است و شدت فی امر اللہ غیر مفقود، زاد اللہ امثالکم فی العالم۔

مہربان من! چند مقدمہ را اوّل خاطر نشین باید ساخت اوّل آنکہ تکفیر کلمہ گو امریست محظور در صحیح وارد است کہ من قال لاخیہ یا کافر فقد باء بہ احدہما۔ حتی المقدور اقدام برآں نباید کرد۔

لہٰذا فقہاء باجمعہم چنیں قرار دادہ اند کہ ہر گاہ (کلام) را یک وجہ محتمل صحت باشد و چند وجہ دیگر محتمل کفر، آں کلام را بر ہماں محمل صحیح عمل باید نمود۔ و لب، بتکفیر قائل نباید

بعد سلام مسنون واضح ہو کہ آپ کا مکتوب گرامی صادر ہوا۔ (اس کو پڑھ کر) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا کہ اس زمانے میں بھی بڑے لوگوں میں حمیت دینی اور اللہ کے احکام کے بارے میں مضبوطی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ جیسے حضرات کی تعداد دنیا میں اور زیادہ کرے۔

مہربان من جواب سے پہلے چند مقدمات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے

۱۔ کسی کلمہ گو کی تکفیر ایک ممنوع امر ہے صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جس کسی نے اپنے بھائی (کسی کلمہ گو) سے مخاطب ہو کر اوکافر کہا تو یہ کلمہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کرے گا۔ (یعنی اگر

گشود دوم آنکہ تکفیر، موافق قاعدہ متعلق
بانکار ضروریاتِ دین است. حسب سوءِ
ادب یا انخفاف مجرد از انکار، یا فعل شنیع
وارتکاب کبیرہ واستخراجِ بدعت و تحلیل
حرام مختلف فیہ و تحریم حلال مختلف
فیہ کفر لازم نمی آید۔ زیرا کہ تعریف ایمان
ہمیں مقرر است کہ ہو تصدیق جمیع ما
علم مجیئ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بضرورۃ
وشئے را از ضروریاتِ دین شمردن موقوف
بر تواتر و ثبوت آں بالقطع است۔ پس
ہر چہ ازیں قبیل باشد مثل انکار
فرضیتِ صلوٰۃ و زکوٰۃ و تحلیل الخمر
و تحریم البیذ و تحقیر الشیخین وغیر ذلک،
البتہ کفر است۔

سوم آنکہ در (عدم) تکفیر و تعدیل
یعنی حکم بعدالت کردن، وسائط بسیار
است ایں نباید فہمید کہ ہر کہ را حکم تکفیر
نکردیم او را پسند نمودیم۔ یا قول او را
جائز داشتیم، بلکہ اکثر اوقات شخص کافر
نمیشود و مبتدع و فاسق می گردد۔ اکثر
ہمیں میدانند کہ ہرگاہ از تکفیر کسے
علماء سکوت کنند، تصویب عقیدہ
او لازم آید، چنیں نیست ایں قاعدہ

مخاطب دراصل کافر نہیں ہے تو کہنے والے
کی طرف یہ کلمہ پلٹے گا)
حتی الامکان تکفیر میں پیش قدمی نہ کرنی
چاہیئے۔ اسی لئے تمام فقہاء اس بات پر
متفق ہیں کہ جب کسی کے کلام کے اندر
ایک صورت ایسی نکلتی ہے جس سے مطلب
صحیح کا احتمال ہے اور چند صورتیں ایسی ہیں
جو احتمال کفر رکھتی ہیں تو کلام کو اسی محمل صحیح
پر رکھا جائے اور قائل کی تکفیر میں
لب کشائی نہ کی جائے۔

(۲) قاعدے کے مطابق تکفیر ضروریات
دین کے انکار سے تعلق رکھتی ہے لہذا
محض سوء ادب یا انکار سے خالی انخفاف
کے باعث یا کسی فعل بد اور ارتکاب کبیرہ
پھر یا استخراجِ بدعت اور مختلف فیہ
حرام کے حلال کرنے یا مختلف فیہ حلال کے
حرام کر لے کے سبب کفر لازم نہیں ہوتا۔
اس لئے کہ "ایمان" کی تعریف یہ کی گئی ہے
کہ جن احکام و ہدایات کے متعلق بالیقین
اور بالبداہت یہ معلوم ہے کہ ان کو رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کے آئے ان سب
کے ماننے اور ان کی تصدیق کر لے کا نام ایمان
ہے۔ اور انہی چیزوں کو اصطلاح میں

بوجہِ احسن ملحوظ باید داشت۔ چوں ایں
ہرسہ قاعدہ ممہد شد حالا انچہ از دیے
دلائل قویہ درحق ایں شخص کہ اقوال
اومر قومِ قلم صواب رقم است
ظاہر می شود، التماس می نماید۔
قول اوّل کہ بسبِّ صحابہؓ کافر نگردد
اگر مرادِ او از صحابہ جمیع صحابہ اند حتیٰ
خلفاء راشدین و ازواجِ مطہراتؓ
پس ایں قولِ او خطاء صریح است
زیرا کہ نزدِ حنفیہ بسبّ شیخین وقذف
عائشہ صدیقہ کفر لازم می آید و اگر مراد
او آنست کہ سبّ ہر صحابی کفر نیست
پس ایں خود خطاء نیست زیرا کہ فقہاً
حنفیہ نیز سبّ ہر صحابی را کفر نمی دانند
بلکہ بدعت و فسق می انگارند و بحدّ کبیرہ
می رسانند۔

و قول ثانی او کہ ہرچند شخص گناہ
کند رحمت زیادہ گردد خطاء فہمی است
منشاء غلط او آنست کہ بعضے لطیفہ گویاں
و شاعراں درمقام دفع ناامیدی خود
بایں لطیفہ تمسک کردہ اند چنانچہ
صاحبِ قصیدۂ بردہ میگوید۔

یا نفس لا تقنطی من زلۃٍ عظمت
ان الکبائر فی الغفران کاللمم

ضروریات دین کہا جاتا ہے، اور کسی
امر کا ضروریات دین سے شمار کرنا موقوف
ہے تواتر اور ثبوت قطعی پر۔ جب اس
قسم کے متواتر اور قطعی الثبوت امورِ
دینیہ سے انکار ہوگا تو کفر یقینی طور پر لازم
ہوگا مثلاً فرضیت صلوٰۃ و زکوٰۃ کا انکار
اور شراب کا حلال قرار دینا اور اسی طرح
نبیذ کا حرام کر دینا یا شیخینؓ کی تحقیر کرنا
وغیر ذلک۔

(۳) تکفیر نہ کرنے اور تعدیل کرنے یعنی عدالت
کا حکم لگانے (بالفاظ دگر عادل قرار دینے)
کے درمیان بہت سے درجے اور کڑیاں ہیں
اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جس کسی پر ہم
نے حکم تکفیر نہیں لگایا تو اس کے قول کو ہم
نے پسند کر لیا۔ یا اس کی بات کو جائز کہہ دیا
بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص
ایک قول سے کافر تو نہیں ہوتا البتہ
بدعتی و فاسق ہو جاتا ہے۔

اکثر ظاہر بین یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب
علماء نے کسی کی تکفیر نہیں کی تو گویا
اس سے اس شخص کے عقیدے کی تائید
و تصویب لازم آگئی۔ ایسا نہیں ہے۔
اس بات کو اچھی طرح ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

لعل رحمۃ ربی حین یقسمہا
تاتی علیٰ حسب العصیان فی القسم
مدعائے آنہا آنست کہ از بزرگیٔ گناہ
خود نباید اندیشید و ناامید نباید شد
زیراکہ رحمتِ الٰہی نیز بقدر عصیان
مقسوم است گناہ کبیرہ (را) ازالۂ بزرگ
کثیرہ تواند کرد این شخص از غلط فہمی
چنیں انگاشت کہ عصیان سبب رحمت
است و این نفہمیدہ کہ اگر بالفرض
عصیان سبب رحمت ہم باشد تا ناص
یکنوع رحمت را سبب خواہد بود کہ
آں رحمتِ غفاریست دیگر انواع
رحمت بسیار ازیں رحمت بزرگتر
وعالی تر اند ہمہ از عاصی موقوف خواہند
شد مثل درجاتِ عالیاتِ بہشت و دخول
بلاحساب و سرخروی در عرصات
الحاصل کہ از رحمتِ متقیان و معصومان
و محفوظان بہرہ نیافت لیکن این ہمہ
غلط فہمی است نوبت بکفر نمی رساند
تا آنکہ صریحاً قائل این کلام نگوید
طاعت و تقویٰ اصلاً موجب رحمت
نیست و عصیان حقیقۃً سبب رحمت
است، و ظاہر است کہ متکلم بکلمہ

جب یہ تینوں باتیں بطور مقدمہ وتمہید
بیان ہوگئیں تو اب اس شخص کے بارے
میں جس کے اقوال آپ نے تحریر فرمائے
ہیں جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ دلائل کیساتھ
لکھی جاتی ہے۔

قائل کا قول اول یہ ہے کہ سبِ صحابہؓ
سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔ غور طلب
یہ امر ہے کہ اسکی مراد کیا ہے؟ اگر صحابہ
سے جمیع صحابہ مراد ہیں حتیٰ کہ خلفاء
راشدین اور ازواج مطہرات بھی۔ اس
صورت میں اس کا قول خطا صریح ہے
اس لئے کہ نزد حنفیہ سبِ شیخینؓ اور
حضرت عائشہ پر تہمت دھرنے سے
کفر لازم آتا ہے اور اگر اسکی مراد یہ ہے
کہ سبِ ہر صحابہ کفر نہیں ہے تو یہ قول
خطا صریح نہیں ہے اس لئے کہ فقہاء
حنفیہ بھی سبِ ہر صحابی کو کفر نہیں جانتے
بلکہ بدعت وفسق سمجھتے ہیں اور گناہِ کبیرہ
کی حد تک پہنچاتے ہیں۔ قائل کا دوسرا
قول یہ ہے کہ جو شخص جتنا گناہ کرے گا
اس پر رحمت زیادہ ہوگی۔ یہ قول غلط
فہمی کی بنا پر ہے اور اسکی غلطی کی بنیاد
ان لطیفہ گو اور نازک خیال شعرا کا کلام

اسلام تصریح باین ہر دو مضمون نخواہد
کرد۔ وقولِ ثالث او کہ حضرت
ام المومنین حضرت بی بی عائشہ صدیقہ
طپانچہ ۔۔۔۔
۔۔۔ نزد افترائے محض است
حاکم شرع را می باید کہ اوّل اورا از سندِ
این افترا بپرسد و ظاہر است کہ از
بیان سندش عاجز خواہد شد و ہرگاہ
عاجز شود اورا تعزیر بزدن سی و
نہ تازیانہ بکمال شدت وایجاع نماید
آیندہ اند توبۂ نصوح گیرد کہ این قسم
افتراہا بر بزرگان نکردہ باشد حاصل
آنکہ مفاد این قول نسبت ظلم شنیع بجانب
صدیقہؓ است و نسبت ظلم بغیر معصوم
موجب کفر نیست آرے نسبت آں بہ
بزرگاں کہ عدالت و تقوی آنہا بہ ثبوت
پیوستہ موجب فسق و ضلالت است
واز باب قذف نیست کہ باجماع کفر است
وقول رابع کہ سید اگرچہ سابّ صحابہ
باشد تعظیم او بر مردمان واجب است
غلط محض است زیرا کہ سید چوں مرتکب
این قسم امر شنیع گردد تعظیم او واجب
نمی ماند واصل نیست کہ در انکار بر منکر

جنہوں نے بطور لطیفہ گوئی و نکتہ سنجی اپنی
مایوسی کو دفع کرنے کے لئے اس بات کو
ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ صاحب قصیدہ بردہ
(علامہ بوصیریؒ) کے بھی اسی مضمون کے
دو شعر ہیں۔ (جن کا ترجمہ یہ ہے)
۱۔ اے نفس اپنے گناہوں کے باعث جو
اگرچہ بہت بڑے ہیں مایوس نہ ہو۔
کیونکہ اللہ تعالےٰ کی رحمت و مغفرت کے
سامنے بڑے بڑے گناہ بھی چھوٹے ہیں۔
۲۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت
کے اس کی بارگاہ سے تقسیم ہوگی تو ممکن ہے
کہ رحمت، بقدر گناہ ہر ایک کے حصے میں
آئے۔

مدعا یہ ہے کہ گناہ کی بڑائی سے اپنے
کو فکرمند نہ کیا جائے اور ناامید نہ ہوا جائے
اس لئے کہ رحمت الٰہی بقدر عصیاں، مقسوم
ہے۔ گناہ کبیرہ کا ازالہ رحمتِ کثیرہ کے
ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

اس شخص نے اپنی غلط فہمی سے یہ تو سمجھ
لیا کہ گناہ، سبب رحمت ہے مگر یہ نہ سمجھا
کہ اگر بالفرض گناہ سبب رحمت بھی ہو
تب بھی ایک نوع رحمت کا سبب ہے اور
وہ "رحمت غفاری" ہے۔ (یعنی گناہ کی

دامر بالمعروف واقامتِ حدود و گرفتن
قصاص واداے شہادت واداے
امانت وعدل در حکومت. تخصیص ہیچ
فرقہ و ہیچ قبیلہ نیست سید و جولاہہ
دریں امر برابر اند ہرگاہ سیّد بسبب
سبِ صحابہ کافر شد سید نماند لانہ
لیس من اہلک انہ، عمل غیر صالح
آرے اگر سیّدے اتلافِ حق خاص
ایں کس کند عزیمت آنست کہ ازو
در گذرد و ترک انتقام نماید۔ لقولہ
علیہ السلام ۔ اقبلوا عن محسنہم و تجاوزوا
وا عن مسیئہم اما اتلافِ حقوق دینی
پس دراں تجاوز مقبول نیست والی اصل
ایں قولِ او نیز خطاء و بدعت است
اما نوبت بکفر نمی رساند زیراکہ
ایجاب تعظیم بمعنی محبت و ترک
ایذا در حق اہل بیت عموماً وارد شدہ
و تخصیص ایں عام در ذہنِ ایں قائل
نگنجیدہ یا حقوق دینی با حقوق انسانی
باہم اشتباہ پیدا کردہ ایں حکم انہ
زبانِ او برآوردہ انکار صریح
ضروریات دین ازیں کلمہ
فہمیدہ نمی شود۔

مغفرت والی رحمت )
دوسری انواع رحمت بھی تو ہیں۔ جو
اس رحمت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں
وہ رحمتیں تو عاصی و گنہگار کو حاصل نہ
ہوسکیں گی۔ مثلاً بہشت کے درجات
عالیات بلاحساب کتاب جنت میں داخلہ
اور میدان محشر میں سرخروئی حاصل
ہونا وغیرہ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ وہ رحمتیں جو
اہل تقویٰ، معصومین، اور محفوظین کے
واسطے مخصوص ہیں عاصی کا ان میں کوئی
حصہ نہیں۔ اور وہ بیچارہ ان کا حق دار
نہ ہوگا۔

مگر اس قسم کی تمام باتیں غلط فہمی کی بنا پر
کہی جاتی ہیں ان سے کفر تک نوبت
نہیں پہونچتی جب تک صراحۃً یوں نہ
کہدیا جائے کہ طاعت و تقویٰ بالکل موجب
رحمت نہیں بس عصیان و گناہ ہی حقیقۃً
سبب رحمت ہے۔

ظاہر ہے کہ کلمۂ اسلام کا بولنے والا کوئی
آدمی اس طرح کی بات صراحت کے ساتھ
نہیں کہے گا۔

قائل کا تیسرا قول کہ ام المومنین حضرت

بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے
نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
شان میں کوئی گستاخانہ حرکت کی۔

یہ افترائے محض ہے حاکم سشرع کو
چاہیئے کہ اول اس سے اس افترا کی
سند طلب کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی سند
نہ پیش کرسکے گا، جب وہ سند پیش کرنے
سے عاجز ہو تو اس کو ۹۳ کوڑے کمال
شدت کے ساتھ لگوائے اور آیندہ کے لئے
اس سے توبۂ نصوح کرائے کہ وہ اس قسم
کے بہتان بزرگانِ دین پہ نہ لگائے کا حاصل
کلام یہ ہے کہ اس قول کا منشا حضرت صدیقہ
پر ایک ظلم شنیع کا الزام لگانا ہے ۔۔۔ اور
غیر معصوم کو ظلم کے ساتھ منسوب کرنا موجب کفر نہیں ہے۔ البتہ ان بزرگوں کے
حق میں ظلم کی نسبت کرنا جن کی عدالت اور جن کا تقویٰ ثابت ہوچکا ہے موجب فسق
و ضلالت ضرور ہے یہ قول باب قذف سے بھی نہیں ہے۔

(آیات سورۂ نور کے نزول کے بعد حضرت صدیقہؓ پر) قذف باجماع، کفر ہے۔

قائل کا چوتھا قول کہ سید اگرچہ صحابہؓ کو برا بھلا کہنے والا ہو بہرحال اس کی تعظیم
لوگوں پر واجب ہے" یہ غلط بات ہے اس لئے کہ جب یہ سید اس قسم کی قبیح حرکات کا
مرتکب ہوگا اس کی تعظیم واجب نہیں۔ اور اصل یہ ہے کہ نہی عن المنکر، امر بالمعروف
اقامتِ حدود، قصاص اوائے شہادت اوائے امانت اور حکومت میں عدل و انصاف
کے معاملے میں کسی طبقہ اور کسی قبیلہ کی تخصیص نہیں ہے ایک سید اور ایک نو یافتان آئے
میں برابر و مساوی ہیں۔ جب کہ سید سبِ صحابہ کے باعث کفر کا مرتکب ہو تو پھر

سید کب رہا۔ ؟ وہ تو غیر صالح عمل کی وجہ سے اہل سے نکل گیا اور لیس من اہلک کا مصداق ہوگیا۔ ہاں اگر کوئی سید اس شخص کا کوئی خاص دنیاوی حق ضائع کر دے تو عزیمت اور بلند کرداری کی بات یہ ہے کہ اس سے درگزر کرے اور انتقام نہ لے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی درگذر کے لئے فرمایا ہے لیکن اگر حقوق دینی تلف کئے جائیں وہاں درگذر اور چشم پوشی مقبول و جائز نہیں ہے خلاصہ یہ ہے کہ قائل کا یہ قول بھی خطاء بدعت ہے اس بات کے کہنے سے کفر تک نوبت نہیں پہونچتی کہ اہل بیت کے حق میں تعظیم بمعنی محبت کا واجب ہونا اور ان کو اہانہ دینے کا حکم عموماً وارد ہوا ہے قائل کے دماغ میں اس عام کی تخصیص نہیں آئی کہ اس نے صحابہ کرام کو برا بھلا کہنے والے سید کے لئے بھی تعظیم واجب قرار دے دی۔ یا حقوق دینی اور حقوق انسانی میں باہم اس کو اشتباہ ہوگیا اور اس لئے دونوں قسم کے حقوق میں فرق نہ کرسکے یہ بات کہدی۔ بہرحال ضروریات دین میں سے کسی بات کا انکار اس قول سے مفہوم نہیں ہوتا۔

---

# مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام

وقار راشدی ایم اے

حضرت شاہ سید نصیر الدین اولیاء دیناج پور میں آسودہ ہیں آپ بے حد متقی پرہیزگار، پابند صوم و صلوٰۃ اور باریاضت درویش تھے۔ اس لئے عام طور پر نیک مرد کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے آپ کو اکثر لوگ عقیدت و احترام سے نیک بابا بھی کہتے تھے۔

جس مقام پر آپ کی سکونت اور آپ کا آستانہ تھا وہ جگہ "نیک مرد" کے نام سے مشہور تھی۔ اس سے پہلے اس جگہ کا نام بھوبند پور تھا۔ اس زمانہ میں وہ مقام ہندوؤں کی پوجا پاٹ کا مرکز تھا اور وہاں "گورکھو ناتھ کا مندر" بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ مندر ہر وقت پجاریوں، پنڈتوں، بھکشوں سے بھرا رہتا تھا۔ بھیم راج اور پرتھوی راج نام کے دو بڑے برہمن ہندو مت کے سربراہ سمجھے جاتے تھے۔ گورکھوناتھ کا مندر براہ راست ان دونوں کے زیر نگرانی تھا۔ بھیم راج اور پرتھوی راج وہاں کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کی حیثیت راجاؤں کی سی تھی اور ہندو عوام ان کی رعایا کی حیثیت رکھتے تھے ان سے بے حد مرعوب اور خوف زدہ تھے اور غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے اشارہ پر اٹھتے بیٹھتے اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ کھیتی باڑی مویشیوں کی پرورش اور روزمرہ کے دیگر کاموں

میں ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ ان حالات میں جب کوئی مسلمان اتفاق سے ادھر آنکلتا تو اسکے اپنی بے بس و بے چارگی کی داستان بیان کرتے اور ظالموں کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچتے۔

حضرت نیک بابا فرشتہ رحمت بنکر اس تیرہ و تاریک دنیا میں پہنچے۔ آپ کی تعلیمات اور اخلاق کریمانہ سے ہندو عوام بڑے متاثر ہوئے۔ انہیں ڈھارس بندھی کہ اب اس عذاب سے نجات مل جائیگی۔ نیک بابا مختلف مقامات پر تشریف لے جاتے اور لوگوں کو مخاطب کرکے رشد و ہدایت فرماتے لوگ بڑی عقیدت سے آپ کے آس پاس بیٹھ جاتے اور ہمہ تن گوش ہو کر آپ کی ایمان افروز باتیں سنتے رہتے آہستہ آہستہ ان لوگوں کے دلوں میں خدا کی یاد جاگزیں ہونے لگی اور پتھر کی مورتی سے متنفر ہونے لگے۔ جب یہ بات بھیم راج اور پرتھوی راج کو معلوم ہوئی تو وہ چراغ پا ہوئے اور حکم دیا کہ اس فقیر کو فوراً راج کے باہر نکال دیا جائے اور کہدیا جائے اگر وہ یہاں رہنا چاہتا ہے تو خدا کی باتیں نہ کرے اور ہمارے مذہب میں دخل نہ دے ورنہ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جائے گا۔"

حضرت نیک بابا نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

میری زندگی اللہ کے لئے وقف ہے کوئی دھمکی مجھے اس نیک مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی اگر میری جان اللہ کی راہ میں چلی بھی گئی تو یہ میرے لئے سب سے بڑی سعادت ہوگی۔

بھیم راج اور پرتھوی راج نے جب یہ دیکھا کہ نیک بابا کسی طرح نہیں مانتے تو انہوں نے آپ کو گرفتار کر لیا کو لیک ندی کے اس پار اس کٹیا میں قید کر دیا۔ بھیم راج اور پرتھوی راج کے ظلم و ستم کی خبر پھیلتے پھیلتے عرب تک پہنچ گئی تو نیک بابا کی حمایت و مدد کے لئے درویشوں کی ایک جماعت مشرقی پاکستان کے لئے عازم سفر ہوئی اور دیناج پور پہنچی اللہ کے شیروں نے بھیم راج اور پرتھوی راج کی فوج

کا مقابلہ کیا باقاعدہ جنگ ہوئی۔ حق کو فتح اور باطل کو شکست ہوئی۔ دونوں ظالم وجابر حاکم موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس وقت سے وہ مقام "نیک مرد" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اہل بنگال نیک مرد سے اس قدر والہانہ عقیدت رکھتے ہیں کہ آپ کو امام الاولیاء بھی کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ضلع دیناج پور اور گرد ونواح میں حضرت شاہ نصیر الدین نیک مرد نے اسلام کی داغ بیل ڈالی اور آپ ہی کے زمانے سے اس علاقے میں مشائخ دین اور اولیائے کرام کی آمد وسکونت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ حضرت نیک مرد کی نیکی اور اس مرد مومن کا کرشمہ تھا کہ آپ کے دم سے کفرستان میں شمع توحید روشن ہوئی، بت پرستی کے بجائے خدا پرستی نے لی اسلام کا بول بالا ہوا۔ آج دیناج پور کا چپہ چپہ اللہ اکبر کی تکبیر سے گونج رہا ہے بھیم راج اور پرتھوی راج اس دنیا میں نہیں رہے لیکن "گورکھو ناتھ کا مندر" آج بھی ان کی بت پرستی کی نشان دہی کرتا ہے اور ظلمت ماضی کی یاد دلاتا ہے۔

حضرت نیک مرد کی وفات کے بعد بہت عرصے تک آپ کی قبر یوں ہی پڑی رہی۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ یہ شہنشاہ اورنگ زیب کا عہد حکومت تھا۔ اس زمانے میں اورنگ زیب کا ایک وزیر بنگال آیا تھا۔ اسے یہ خبر ملی کہ سرزمین بنگال میں دیناج پور ایک مقام ہے جہاں حضرت شاہ نصیر الدین المعروف بہ نیک مرد مدفون ہیں مگر آپ کی قبر کی حالت خستہ ہے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ اس قبر کو درگاہ کی شکل دے دی جائے تاکہ ایک بندۂ خدا کا مقبرہ محفوظ ہو جائے اور آنے والی نسل کو یہ یاد رہے کہ اللہ کی راہ میں جینے والے کبھی مرتے نہیں بلکہ ہمیشہ زندہ وتابندہ رہتے ہیں۔ وزیر نے بادشاہ اورنگ زیب کو حضرت نیک مرد کی نیکی وبزرگی کی داستان سنائی۔ بادشاہ بہت متاثر ہوئے اور ایک فرمان کے مطابق حضرت کے مزار کی تعمیر کے لئے تین سو بیگھہ زمین منظور فرمائی وزیر موصوف کے حسب ہدایت شاندار مزار تعمیر ہوا۔ آج بھی ہر سال بیساکھ کی پہلی تاریخ کو نیک مرد کا عرس ہوا کرتا ہے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے ہیں اور

اپنے پیر بابا کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ میلہ تین دن تک لگا رہتا ہے
یہ میلہ، میلہ "نیک مرد" کے نام سے مشہور ہے۔

دیناج پور کے اور چند بزرگان دین قابل ذکر ہیں ان کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

"بنگال اور آسام کے پیر اولیاء کی کہانی" مصنفہ مولانا عبدالحیٔ (بنگلہ ) میں ان حضرات کا مختصر حال درج ہے شہر دیناج پور سے چھ میل دور شمالی جانب گاؤں خالوخول میں غازی صاحب، شہر دیناج پور میں حضرت گورالیہ صاحب، نیتوپور سے دو میل شمال کی طرف شیتوپور نامی دیہات میں پیر مانک جہاں اور بی بی سوریا، نیتھوپور سے آدھ میل جنوب کی طرف دیہات شیونی نی میں حضرت بالا شہید، نیتوپور سے دو میل جنوبی جانب حضرت پاگل دیوان، شیشار سے دو میل دور مغربی جانب گھاٹ نگر میں حضرت گورا شہید، بابو گھاٹ سے چودہ میل جنوب کی طرف کانتا باڑی مندر میں حضرت پیر صدرالدین، دیب کوٹ درگ سے ایک میل کے فاصلہ پر دھوموندی کے کنارے حضرت مولانا آفتاب الدین قطب پیر گنج اسٹیشن سے پانچ میل دور مغرب کی طرف گوگور دیہات میں حضرت بن پیر صاحب، بالو گھاٹ سے متصل کنجن پور میں ظہیرالدین احمد پیر گنج اسٹیشن کے نزدیک حضرت شیخ سراج الدین اور رائے گنج اسٹیشن سے چھ کوس شمال جانب حضرت حسین مور یا بغدادی کے مزارات ہیں۔

ان کے حالات زندگی اور دینی خدمات کے متعلق تذکروں اور سوانح کی کتابوں میں تفصیلی معلومات نہیں ملتیں۔ تذکرہ نویس اور سوانح نویس خاموش ہیں جن علاقوں میں یہ مردان پاک محو خواب ہیں وہاں کے اہل علم اور اہل قلم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان حضرات کی سوانح حیات کے بارے میں مزید چھان بین کریں اور ان کے حالات منظر عام پر لائیں اس طرح نہ صرف ان برگزیدہ ہستیوں کے حالات و خدمات سے سوانح و تصوف کے بارے میں گرانقدر اضافہ ہوگا۔ بلکہ یہ علم اور دین کی بڑی اہم خدمت ہوگی۔ اہل وطن ان حضرات کی خدمات کی روشنی میں استفادہ کر سکیں گے اس قسم کے تذکرے ماحول و معاشرے

کی اصلاح و تطہیر کے لئے بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ زندہ قوموں کا کردار، بزرگان اسلاف نیک کردار اور باعمل زندگی کی بنیاد پر پروان چڑھتا ہے۔ باوقار ہیں وہ قومیں جو اپنے اسلاف کے کارناموں کو تصنیف و تالیف کی صورت میں زندہ رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا ابراہیم تشنہ قادری اپنے دور کے جید عالم اور جلیل القدر بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۸۹ھ میں بائی آکل گاؤں تھانہ، کانائی گھاٹ ضلع سلہٹ میں ہوئی۔ آپ کا لقب شاہ تقی الدین تھا۔ آپ حضرت عبدالرحمن قادری کے فرزند ارجمند تھے۔ سرزمین بنگال میں عموماً اور نواح سلہٹ میں خصوصاً سلسلہ قادریہ کو فروغ دینے میں حضرت عبدالرحمن قادری اور ان کے نور نظر حضرت مولانا ابراہیم علی تشنہ کا خاصہ حصہ رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علی تشنہ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ پھول باڑی سلہٹ میں حاصل کی آپ کی عقل علم کا فطری شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لئے آپ نے مختلف مقامات میں قیام فرمایا اور علوم فنون کے اساتذہ کرام سے فیضیاب ہوئے فقہ اور حدیث کی تعلیم کے لئے دیوبند تشریف لے گئے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد دلی گئے۔ نو سال تک وہاں رہے اور تکمیل تعلیم کے بعد اپنے وطن سلہٹ واپس آئے اور درس و تدریس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

مولانا ابراہیم علی تشنہ کے دل میں حصول علم کی ایک تڑپ تھی اور ہمیشہ اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھتے رہے۔ ۱۳۲۲ھ میں پھر ایک بار گھر سے باہر نکلے اور دینی علوم کو مزید فروغ دینے کی غرض سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مولانا ناظر حسن دیوبندی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ علم و عرفاں، تصوف و معرفت کے اعلیٰ نکات سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید ہوئے اور کئی سال تک ان کی خدمت چشمۂ فیض سے مستفیض ہوتے رہے۔ حضرت قاری عبداللہ مکیؒ کی صحبت فیض سے بھی فیضیاب ہوئے۔

حضرت مولانا ابراہیم علی تشنہ شعر و شاعری سے بڑا شغف تھا۔ تشنہ تخلص

کرتے تھے جہاں فن تصوف میں ایک بلند مقام رکھتے تھے وہاں آپ کی شاعرانہ حیثیت بھی مسلم تھی۔ آپ کے معرفتی اور مرشدی گیت بڑے مشہور ہیں۔

مشرقی پاکستان کے لوک گیتوں میں معرفتی اور مرشدی گیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان گیتوں میں خدا، دین، مذہب اور مناظرِ فطرت کا ذکر خاص والہانہ انداز میں ہوتا ہے۔ خدا کی وحدانیت، اس کی صفات قدسیہ اور انسان کی عبودیت ان کے گیتوں کے خاص موضوعات ہیں۔ یہ گیت ابتدا میں درویشوں اور صوفیوں کے فیض و کرامات سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔ اور بعد میں یہ خود اولیائے کرام کے اپنے تاثرات و خیالات کا آئینہ دار بن گئے حضرت تشنہ کے معرفتی و مرشدی گیتوں کی تعداد تین سو آٹھ ہے ایک ایک گیت میں تصوف کے نکات اور شریعت و معرفت کے اسرار و رموز نہایت دلچسپ اور موثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں جن کے مطالعے سے روح میں پالیدگی اور طبیعت میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ معبود حقیقی سے والہانہ عشق اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت کے جذبات کو جس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس سے ایمان میں شگفتگی محسوس ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علی تشنہ پر آخری عمر میں کچھ ایسا عالم مجذوبیت طاری ہوا کہ گھر بار چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ کنج عزلت میں اللہ اللہ کرتے رہے عبادت و ریاضت میں کچھ اس طرح مست تھے کہ کبھی خود بخود ہنستے رہتے اور کبھی روتے رہتے۔

حضرت تشنہ ایک درویش عامل کے تمام اوصاف سے موصوف تھے آپ ہر وقت اللہ کی عظمت اور اس کی صفات بیان فرماتے۔ سنہ ۱۳۵۰ھ میں ایک سو سال کی عمر میں دارالفانی سے دارالبقا کی راہ لی اور اپنے دوست حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

جلال پور سلہٹ میں آپ کا مزار مقدس مرکز زیارت درو حانیت ہے۔

# لغت القریش

ڈاکٹر مدد علی قادری سندھ یونیورسٹی۔

لغت قریش پر اظہار خیال سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زبان عربی کا مختصر سا جائزہ لیا جائے۔ عربی زبان سامی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اسکی نشو ونما نجد و حجاز میں ہوئی۔ تمام علمائے لغت کی تحقیق ہے کہ پہلا شخص جس نے عربی زبان میں بات کی وہ حضرت اسمٰعیل بن حضرت ابراہیم علیہ السلام ہے تیسری صدی کے ایک بلند پایہ راوی اور عالم محمدؒ بن سلام جمحیؒ کا قول ہے :- اول من تکلم بالعربیہ ونسی لسان ابیہ اسمٰعیل علیہ السلام (سب سے پہلا انسان جس نے عربی زبان بولی اور اپنی پدری زبان کو بھلا دیا وہ اسمٰعیل علیہ السلام تھے)

(المزھر۔ ج ۱ ص ۳۲)

عربی زبان کو علمائے لغت نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱- قحطانیہ یا لغۃِ حمیر۔ یہ بنو قحطان کی زبان ہے اور اسکی پرورش یمن میں ہوئی

۲- عدنانیہ یا لغۃ مضر۔ یہ بنو عدنان کی زبان ہے اور یہ نجد و حجاز میں پرورش پائی

(المزھر۔ ج ۱ ص ۳۱)

ان دونوں زبانوں کے الفاظ اور صرف و نحو میں کافی بڑا فرق ہے۔ یہاں تک کہ علمائے لغت کے ایک گروہ نے قحطانیہ یا لغتِ حمیر کو غیر عربی قرار دیا ہے۔ ابو عمرو بن

العلاء سے منقول ہے، وہ کہا کرتا تھا:۔ ما لسان حمیر بلساننا ولا لغتہم بلغتنا (حمیر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے اور ان کا لہجہ ہمارا لہجہ نہیں ہے۔

(فقہ اللغۃ لوافی ص ۷۲)

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ زید بن عبداللہ، بن دارم کسی حمیری بادشاہ کے پاس گیا وہ بادشاہ اس وقت ایک بڑے پہاڑ پر دربار لگائے ہوئے تھا۔ زید نے بادشاہ کو سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ بادشاہ نے اسے کہا ثِب (یعنی اجلس۔ بیٹھ جاؤ) لیکن اس شخص نے سمجھا کہ بادشاہ کا مطلب ہے کہ میں پہاڑ سے کود کر دکھاؤں۔ چنانچہ فوراً بادشاہ سے کہا۔ لتجد نی ایہا الملک مطواعا (اے بادشاہ آپ مجھے بڑا فرمانبردار پائیں گے) یہ کہکر وہ پہاڑ سے کود کر مرگیا۔ بادشاہ نے درباریوں سے دریافت کیا اسے کیا ہوا؟ درباریوں نے بتایا کہ وہ شخص لفظ ثب کا مفہوم غلط سمجھا۔ بادشاہ نے کہا اما انہ، لیست عندنا عربیتہ من دخل ھنا حمّر (ہمارے ہاں عربی تو بولی نہیں جاتی۔ بس جو شخص یہاں آئے اسے حمیری زبان سیکھنی چاہیئے)

(فقہ اللغۃ لوافی ص ۵)

لہٰذا خالص عربی نجد و حجاز کی ہی تسلیم کی جاتی ہے۔

عربی زبان کتنی قدیم ہے یہ ایک بڑا تحقیق طلب مسئلہ ہے جسکہ علمائے لسانیات آج تک صحیح طور پر حل نہیں کر سکے۔ تاہم سہولت کے لحاظ سے عربی زبان کے دو نام رکھ دیئے ہیں۔

۱- عربیہ بائدہ (ناپید عربی)

۲- عربیہ باقیہ

شمال حجاز اور مدائن صالح میں عربی کے کچھ کتبات ملے ہیں۔ لیکن بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کتبات کی عربی موجودہ عربی سے مختلف ہے علمائے لغت نے ان نقوش و کتبات کی عربی کو عربیۂ بائدہ کا نام دیا ہے۔ نقوش مندرجہ ذیل ہیں

(۱) النقوش اللحیانیہ ۔ یہ نقوش لحیانی قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان قبائل کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا۔ یہ نقوش ۲۰۰ قبل مسیح کے ہوسکتے ہیں۔

(۲) النقوش الثمودیہ ۔ یہ نقوش قبائلِ ثمود سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا زمانہ ۳۰۰ سے ۴۰۰ صدی عیسوی ہوسکتا ہے۔

۳۔ النقوش الصفویہ ۔ دمشق کے قریب خطۂ صفا میں یہ کتبات ملے ہیں ان کا زمانہ عیسوی سنہ کی تین صدیاں ہوسکتا ہے۔

۴۔ نقش النمارہ ۔ دمشق کے قریب نمارہ میں یہ کتبہ ملا ہے ۔ جس کا سن تین سو اٹھائیس عیسوی ہے۔

۵۔ نقش الزبطی ۔ حلب کے مشرق میں زبد کے مقام پر ایک کتبہ ملا ہے جس کا سن ۵۱۲ عیسوی ہے۔

۶۔ نقش حوران ۔ دمشق کے جنوب میں ایک کتبہ ملا ہے جس کا سنہ ۵۶۸ ہے

(فقہ اللغتہ ۔ وافی ص ۹۴)

مندرجہ بالا نقوش اس زبان سے تعلق رکھتے ہیں جو اب سے کئی ہزار سال پہلے ختم ہوچکی ہے اسی کو عربیہ بائدہ کہتے ہیں یعنی مردہ زبان ۔ اور جو عربی زبان باقی رہی اسکو علمائے لغت عربیہ باقیہ کہتے ہیں۔

عربیہ باقیہ کتنی قدیم ہے؟ یہ ایک معمہ ہے۔ اس زبان کے آثار ہمیں عربوں کے جاہلیت کی دور کے عربی ادب میں ملتے ہیں۔ اور وہ شعرائے جاہلیہ کے اشعار حکمار اور خطبار کے خطبات ہیں۔ اس ادبی سرمایہ کو عہد اسلامی کے ابتدائی دور میں مدون کیا گیا اور ان کی تاریخ زیادہ سے زیادہ ۵۰۰ عیسوی ہوسکتی ہے۔

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ عربوں نے اس زمانہ میں کوئی آثار نہیں چھوڑے کیونکہ جہالت ان میں بہت زیادہ تھی۔ لیکن یہ رائے حقیقت کے برعکس ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دور جاہلیت میں قراءۃ و کتابت سے کئی لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ اشعار لکھ کر خانۂ کعبہ میں آویزاں کئے جاتے تھے۔ دور جاہلیت کے

مشہور شعراء کے اشعار معلقات، سبع کا قصہ نہایت مشہور ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی کاتب تھے جن میں حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت زید بن ثابتؓ حضرت معاویہؓ اور حضرت لوی بن کعب قابل ذکر ہیں۔ اور ان سب نے زمانۂ جاہلیت میں ہی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ قرآن حکیم میں خود اسکی طرف اشارہ ہے۔ ن والقلم وما یسطرون۔

بہر حال عربی نجد و حجاز کے مختلف قبیلوں میں مستعمل تھی۔ جغرافیائی حالات کا انسان کی زبان پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اسی بنا پر ہر قبیلہ کا اپنا اپنا لہجہ مخصوص ہو گیا۔ کچھ قبیلوں پر ہند و ایران کا اثر، کچھ قبیلوں پر یمن کا اثر، کچھ قبیلوں پر آرمینوں کا اثر پڑا۔ چنانچہ ایک چیز کے لئے اگر ایک لہجہ میں کوئی ایک لفظ استعمال ہو رہا تھا تو دوسرے لہجہ میں اسی شئے کے لئے دوسرا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ ازد قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ رسول اکرم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کے ہاتھ سے چھری گر گئی تھی۔ آپؐ نے حضرت ابوہریرہ سے فرمایا۔ ناولنی السکین (چھری اٹھا دیجئے) حضرت ابوہریرہؓ نے سکین کا لفظ پہلی دفعہ سنا تھا۔ یہ لفظ سنکر مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے کبھی داہنی طرف دیکھتے اور کبھی بائیں طرف۔ رسول اکرمؐ نے دوبارہ آپ سے فرمایا۔ "ناولنی السکین" آپ پھر بھی ادھر ادھر دیکھنے لگے اور مطلب نہ سمجھ سکے۔ کچھ وقفہ بعد رسول کریم سے فرمایا۔ المدیۃ تریل (کیا آپ کی مراد چھری سے ہے) اور اس کی طرف اشارہ کیا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ جی ہاں حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ سکین کا لفظ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا۔

(فقہ اللغۃ ص ۱۲۲)

## اختلافِ لغات العرب

مختلف قبائل کے لہجہ اس طرح مختلف تھے۔ اور یہ اختلاف کئی اعتبار

سے تھا۔

۱- حرکات میں اختلاف :- نَسْتَعِیْنُ اس لفظ کے نون کو کچھ قبیلے زیر سے پڑھتے ہیں اور کچھ قبیلے زبر سے۔ معکم کو کچھ قبیلے مَعَکُمْ اور کچھ مَعْکُمْ کہتے ہیں۔ اولئکَ کو کچھ قبیلے اولَیِکَ اور کچھ الالکَ کہتے ہیں۔ مستھزون کو کچھ قبیلے مُسْتھزُون اور کسی قبیلے ہیں مُسْتَھزِئُون پڑھا جاتا ہے۔

۲- تقدیم و تاخیر کا فرق - کچھ الفاظ کے حرفوں میں کوئی قبیلہ تقدیم کرتا ہے تو کوئی تاخیر مثلاً صاعقۃ کو صاقعۃ۔ المبرد کا قول ہے کہ اہل حجاز صاعقہ کہتے ہیں اور بنو تیمم اسے صاقعہ کہتے ہیں۔ کہیں حرفِ صحیح کو معتل کرتے ہیں مثلاً اما کو کچھ قبیلے ایما بولتے ہیں۔ کچھ قبیلے کہتے ہیں اشترِوالضلالۃ اور کچھ اشترُ الضلالۃ۔ پڑھتے ہیں۔

۳- تذکیر و تانیث کا فرق :- کچھ قبیلے کہتے ہیں ھٰذِہِ البقرہ اور کچھ ھٰذا البقرُ یہاں تک کہ قرآن مجید میں تذکیر آیا ہے۔ و ان البقر تشابہ علینا (البقرۃ ۲/۷۰)

۴- اعراب کا اختلاف :- تیمی کہتے ہیں ما زید قائمٌ اور دوسرے قبیلے کہتے ہیں ما زیدٌ قائماً یعنی تیمی ما کا عمل لیس جیسا نہیں لیتے۔ اسی طرح بنو حارث بن کعب کی لغت میں ہے اِن ھذان اور دوسرے تمام قبیلے کہتے ہیں اِن ھذَھنِ قواعد کے لحاظ سے اِنّ ھذَینِ ہونا چاہیئے قرآن حکیم میں بھی ایک جگہ آیا ہے۔ اِن ھذان لساحرانِ۔
(طٰہٰ ۲۰/۶۳)

غرضکہ نجد و حجاز میں بیک وقت بہت سے لہجے تھے جن میں قریش کنانۃ۔ اسد، ھذیل، ضبۃ، معبد اور ثقیف نمایاں تھے۔

(الصاحبی ص - ۲۸)
لابن فارس

طلوع اسلام سے پہلے ہی قدرت نے قریش کے لہجہ کو دیگر تمام لہجوں پر فوقیت دی تھی اور اس کے کئی وجوہات تھے۔

قریش مکہ معظمہ اور اس کے اطراف میں رہتے تھے۔ مکہ کو ہر اعتبار سے مرکزیت حاصل تھی مکہ خانہ کعبہ تھا۔ جس کے متولی بھی قریش تھے۔ اسلام سے پہلے بھی عرب حج کیا کرتے تھے اور خانہ کعبہ کے متولی ہونے کے باعث قریش کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ اور سب قبیلے اپنے جھگڑے بھی انہی سے فیصل کرایا کرتے تھے۔ اقتصادیات و تجارت بھی زیادہ تر قریش کے ہی ہاتھ میں تھی اس طرح قریش کو سیاسی اقتصادی اور مذہبی اقتدار حاصل تھا۔ اور جبکو اتنی برتری حاصل ہو اسی کی زبان کو رائج ہونے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ (فقۃ اللغۃ لوافی - ص ۱۱۰)

چنانچہ اسلام سے پہلے ہی قریش کے لہجہ کو تمام لہجوں پر برتری حاصل تھی اور اسی کا سکہ چلتا تھا۔

ہاں قریش کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ جب بھی کسی قبیلہ کا کوئی لفظ، محاورہ یا ضرب المثل سنتے اور پسند کرتے تھے تو اسے اپنا لیتے تھے۔ اسمٰعیل بن ابی عبیدہ کا قول ہے۔

وکانت قریش مع فصاحتها وحسن لغاتها
ورقة ألسنتها إذا أتتهم الوفود من العرب
تخيروا من كلامهم وأشعارهم احسن لغاتهم
وأصفى كلامهم، فصاروا بذلك أفصح العرب
ألا ترى أنك لا تجد فى كلامهم عنعنة تميم، ولا
عجرفية قيس، ولا كشكشة أسد، ولا كسكسة ربيعة
ولا الكسر الذى تسمعه من أسد و قيس۔

ترجمہ - قریش اپنی فصاحت، عمدہ لغت، رقیق لسانی کے باوجود اپنے پاس آئے ہوئے عرب قبیلوں کے کلام اور اشعار میں سے اچھے محاورے اور پختہ کلام منتخب

کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سب عربوں میں فصیح بن گئے۔ ان کے کلام میں نہ تو تمیم کا عنعنہ ہے نہ قیس کی عجرفیہ نہ اسد کا کشکشہ نہ ربیع کا کسکسہ اور نہ اسد قیس کی زیر۔

عنعنہ۔ تمیمی ہمزہ کو عین سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً

اسمعت اُنّ کی بجائے کہیں گے سَمِعتَ عنّ

کشکشہ بنو اسد کاف کو یا شین میں تبدیل کر دیتے ہیں اور یا کاف کے بعد شین بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً علیك کی بجائے علیش یا علیکش کہتے ہیں

کسکسہ۔ بنو ربیعہ کاف کو یا سین سے بدل دیتے ہیں یا کاف کے بعد سین بڑھا دیتے ہیں مثلاً علیک کی بجائے علیس یا علیکس کہتے ہیں۔

(الصاحبی۔ ص ۵۱-۵۲)

یہ سب مذموم لغات کہلاتی ہیں اور لغات کی ان تمام قباحتوں سے اللہ نے قریش لہجہ کو پاک رکھا۔ اور اس زبان لسانٍ عربیٍ مبین کے نام سے پکارا اور اپنی آخری کتاب اپنے آخری نبی صلعم پر اسی زبان میں نازل فرمائی۔

قرآن شریف کی زبان بھی بحیثیت علم کے معجزہ ہے۔ عرب کے تمام ادیبوں اور علما کو جب یہ کھلا چیلنج دیا گیا کہ سورۂ کوثر کی طرح صرف ایک آیت ہی پیش کر دیں تو باوجود دماغی کوشش اور ذہنی کاوش کے ان ادیبوں کو یہ کہنا پڑا۔

لیس ھذا کلام البشر

اور اس طرح قرآن حکیم نے اپنی زبان دانی کا لوہا منوا لیا۔

---
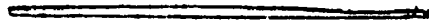
# انسان اور اس کا مقام فلسفہ ولی اللہی کی نظر میں

علامہ محمد صدیق ولی اللہی

انسان کبیر یا دوسرے لفظوں میں انسانیت کا طبعی تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر انسان میں اچھے اخلاق پیدا ہوں اور وہ برے اخلاق سے اجتناب کرے، اس حیثیت سے نوع انسانی کا ہر صحیح الفطرت انسان عدل انصاف، رحمدلی، حیا وغیرہ کو اچھا سمجھے گا اور چوری ظلم اور بے حیائی اور دوسرے برے اخلاق کو برا تصور کرے گا۔ خدا پاک کی عبادت اور اس کی نافرمانی کو بھی اسی پر قیاس کریں۔ لیکن جب انسان عالم شہادت یا عالم عناصر میں آتا ہے تو اس کے ساتھ حیوانیت کا تقاضا بھی لاحق ہو جاتے ہیں پھر وہ اپنی استعداد کے لحاظ سے دونوں قسم کے اوصاف کا حامل ہو سکتا ہے۔ انسان کبیر یا انسانیت کے اوصاف تو اس میں پہلے سے موجود تھے۔ اب اس میں حیوانیت کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں جیسا کہ کھانا، پینا، اپنی تندرستی کا خیال رکھنا اور اپنی نسل کو برقرار رکھنے کا دھیان ہوتا ہے۔ اوّل کو ملکیت اور دوسرے کو حیوانیت کا نام دیا جاتا ہے۔ ان دونوں تقاضوں کو اعتدال پر رکھنا انسانی فطرت ہے، اسی لحاظ سے انسانی فطرت اقترابات اور ارتفاقات کو اعتدال پر رکھنے کا نام ٹھہرا۔

قرب الٰہی حاصل کرنے کا نام اقتراب ہے اور یہ شوق انسان کے روحانی نقطہ کا تقاضا ہے، معاش کا اچھے طریقوں سے حاصل کرنا ارتفاق کہلاتا ہے لیکن اس کے

ضروری ہے کہ معاش کی تلاش میں کسی پر ظلم اور تعدی نہ کیا جائے۔ یہ انسانی جسم کا تقاضہ ہے جو کہ حیوانیت اور ملکیت دونوں قوتوں کا متحمل ہے اگر صرف حیوانیت کا تقاضا دیکھیں تو اس میں یہ سب صفات رذیلہ آجاتی ہیں کمزوروں پر ظلم و زبردستی اقتدار پسندی، تکبر، سرمایہ داری، ظاہری و باطنی نجاست سے ملوث ہونا، قیامت اور اعمال کی جزا و سزا سے غافل ہونا، اور لقائے الٰہی جو روحانی حیات کا تقاضا ہے اس کو بالکل بھلا دینا، حیوان خصلت لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا وغیرہ۔

ملکیت اور حیوانیت دونوں قوتوں میں توازن برقرار رکھنا اور ان کو افراط اور تفریط سے بچانا انسانی نوع کا تقاضا ہے، اگر دونوں اقتضاؤں میں سے ایک کو کم کر دے گا تو انسانیت کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسانی طبیعت کا میلان حیوانیت کی طرف زیادہ ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ملکیت کو حیوانیت پر غالب رکھا جائے، جس کی طرف زیادہ ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ملکیت کو حیوانیت پر غالب رکھا جائے۔ جس کی یہ صورت ہے کہ حیوانیت کو نیکی اور اچھے کاموں میں لگایا جائے۔ شاہ صاحب کی رائے میں ہر جاندار کی تقدیر وہی جو اس کی صورت نوعیہ میں اس کو عطا ہوئی ہے۔ مثلاً اونٹ کی تقدیر یہ ہے کہ اس کو صورت نوعیہ دے کر الہام کیا گیا ہے کہ اپنی تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے یہ چیزیں کھائے اور یہ نہ کھائے، مثلاً اگر گھوڑے کو گوشت کھانے کی عادت پڑے تو وہ بیمار ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان کو بھی صورت نوعیہ عطا ہوئی اور اسے یہ الہام ہوا کہ وہ حیوانیت اور ملکیت دونوں قوتوں کا باہمی توازن قائم رکھے اور حیوانیت پر ملکیت اور عقل کو غلبہ دے سوچ سمجھ کر اقتراب (خدا پرستی) اور ارتفاق (انسان دوستی) جیسے کاموں کو حاصل کرے اور اپنی سوسائٹی میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرے، دوسرے کے حقوق میں دست درازی نہ کرے اور اپنی تمام ہمت اور عقل سے اس بات پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کس کام کے لئے پیدا کیا ہے اور کس لئے مجھے اس انسانی سوسائٹی میں رکھا ہے، یا دوسرے لفظوں میں

خدا تعالیٰ کو راضی رکھنے کے لئے کیا کام کیا جائے اور انسانی سوسائٹی کو کس طرح نفع پہنچایا جائے۔ یہ ہے انسان کی تقدیر۔ اگر کوئی انسان اپنی تقدیر کے خلاف کام کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ انسان اپنے ہم جنس حیوانات کے ساتھ حیوانیت کے کاموں میں شریک رہتا ہے جیسا کہ بھوک، پیاس، شہوت، حرص، دشمن سے لڑنا وغیرہ یہ ایسے خصائل اور عادات ہیں کہ انسان، ان خصائل میں باقی حیوانات کے ساتھ شریک ہے، انسان کو اس کے علاوہ دو بڑے جوہر بھی عطا ہوئے ہیں جن میں وہ منفرد ہے پہلا جوہر لقائے الٰہی کا اشتیاق اور محبت الٰہی ہے یہ جوہر اس کے روح کے اندر ودیعت رکھا گیا ہے، دوسرا جوہر عقل ہے جو اس کے دماغ میں ودیعت ہے۔ پھر اس کو جسم کثیف دے کر اس عالم شہادت یا عالم اجساد میں بھیجا گیا تاکہ یہاں تعلیم پاکر آخرت کے آنے والے منازل کے لئے تیاری کرے اور اس اخروی عالم میں جو انعام واکرام ہیں ان سے حظ اٹھائے وہ جہاں اگرچہ لطیف ہے، مگر اس میں انعامات اس کثیف جہاں کے انعامات سے مشابہت رکھتے ہیں۔

انسان کو چاہیئے کہ ان کو جو یہ اعلیٰ درجے کے جوہر عطا ہوئے ہیں ان کی حفاظت کے لئے اپنی حیوانیت کو عقل کے ماتحت رکھ کر روح کے اندر والے جوہر کی پرورش کرے، کیونکہ اس نورانی نقطے کی پرورش اصل مقصود ہے، عالم جسمانی کثیف ہے اس کا اپنی جسمانی زندگی کی طرف میلان زیادہ ہوتا ہے اور پھر شیطان کی یہ شرارت جاری رہتی ہے کہ وہ حیوانیت کے دریچے سے وسوسہ ڈالتا رہے تاکہ انسان اپنی انسانیت سے گر جائے، اس سے انسان کو ہر وقت بچنا چاہیئے۔

انسان کے اندر تین اعضائے رئیسہ ہیں۔ دماغ، دل اور جگر۔ جگر انسانی بدن کا خادم ہے وہ جسمانی ضرورتوں کے لئے دماغ کو جزو تیار کرتا ہے، پھر اس ضرورت کے پورا کرنے کا راستہ سوچتا ہے اور اس کو دل کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اگر قلب نے اس راستہ کو پسند کر لیا تو وہ اپنے لشکر یعنی اعضا کو حکم دیتا ہے کہ

اس ضرورت کو جگر کی طرف سے سوچے ہوئے راستہ سے پورا کریں۔ اگر یہ تینوں اعضائے رئیسہ آداب شرعیہ سے، یا کسی اہل کی صحبت یا ریاضت سے مہذب ہو گئے اور ان کا ملکیت کی طرف میلان ہوا تو ملائکہ کی طرف سے (جو کہ انسان کی ملکی قوت کے خادم ہیں) الہام ہونا شروع ہو جاتا ہے اور انسان کے حیوانیت کے تقاضے یعنی جگر کے تقاضے عقل اور قلب کے ذریعے مقہور اور مغلوب ہو جاتے ہیں اور اس سے سوسائٹی کے قوانین کی پابندی کا رجحان بھی پیدا ہوتا ہے۔

فلسفۂ الہیات میں یہ بات مسلم ہے کہ عالم عناصر اور جو میں دو مخفی طاقتیں موجود ہیں، ذاتی طور پر ان دونوں میں کوئی شر نہیں ہے، البتہ نوع انسان کے لحاظ سے جو بھی مخفی طاقت انسان کے لئے ضرر رساں اور نقصان دہ ہو گی اور انسانیت کی تکمیل میں رکاوٹ بنے گی تو ہم اس کو مضر اور نقصان دہ سمجھیں گے

جب انسان کے اندر یہ تین اعضائے رئیسہ پیدا ہو جاتے ہیں تو غذا کے ہضم در ہضم سے خون صالح پیدا ہوتا ہے اور قلب کے زور سے تمام بدن میں پھیل جاتا ہے اور دورہ کرتا ہے تاکہ ہر ایک عضو کو اس کی حیثیت کے مطابق حصہ ملتا رہے اس خون سے جو بخار پیدا ہوتا ہے اس کو روح حیوانی کہتے ہیں، اطباء اور ڈاکٹر اسی کی صحت اور تندرستی سے بحث کرتے ہیں ان کا مطمح نظر یہی روح حیوانی ہوتا ہے۔ اہل وجدان یعنی اولیائے کرام نے اپنے وجدان اور ذوق سلیم سے یہ ثابت کیا ہے کہ عرش کے اوپر ایک الہی تجلی اعظم قائم ہے عرش عظیم کے نیچے ایک مقام ہے جس کو حظیرۃ القدس کہا جاتا ہے۔

---

# رسالہ گنج الاسرار

از ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد میں ایک مخطوطہ ہے جس کا نام سرورق اسطرح آتا ہے۔

"رسالہ شیخ الاسلام فریدالحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز"

مخطوطے کے آغاز و اختتام کی عبارتوں میں یہ صراحت ہے کہ اس رسالہ کا نام گنج الاسرار ہے اور اس کے مصنف حضرت فریدالدین مسعود ابن سلیمان ابن ابی بکر ابن عمر صلاح (رحمہم اللہ) ہیں اس نام سے معاً یہ خیال آتا ہے کہ یہ مصنف غالباً حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (م سنہ ۶۶۴ھ) ہوں گے۔ کیونکہ ان کا اسم گرامی بھی مسعود ابن سلیمان ہے لیکن عام تذکروں میں ان کا نسب نامہ اس طرح آتا ہے۔

شیخ فریدالدین مسعود ابن جمال الدین سلیمان ابن شیعب[1] ابن احمد شاہزادہ ابن خواجہ یوسف شہزادہ ابن شیخ محمد ابن شہاب الدین ابن شاہ احمد فرخ شاہ (بادشاہِ کابل) ......[2]

یعنی معلوم ہوا کہ باباصاحب علیہ الرحمہ کے اسلاف ہمارے مخطوطے کے مصنف کے اجداد

---

[1] شیخ شعیبؒ (فاروقی) کے صاحبزادے شیخ عبداللہؒ کی اولاد میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ ہیں

[2] یہ نسب نامہ خزینۃ الاصفیاء جواہر فریدیہ اور اورنیٹل کالج میگزین لاہور (فروری سنہ [illegible]ء صفحہ ۱۱۸) میں درج ہے۔

سے مختلف ہیں۔ مزید یہ کہ اسی رسالہ کا ایک نسخہ جو انڈیا آفس، لندن میں (بحوالہ فہرست مخطوطات جلد اوّل۔ صفحہ ۱۲ ۵ ا مخطوطہ نمبر ۲۸۰۲/۳) موجود ہے اس میں مخطوطے کا نام اس طرح آتا ہے۔

رسالہ باری دربیان وشرح معرفتِ دل و ماہیتِ آن"

اور مصنف کے نام کے آخر میں بخاری لفظ کا اضافہ ہے۔ اس لئے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمہ اس رسالے کے مصنف نہیں ہیں۔

اسی رسالے کا ایک اور نسخہ برٹش میوزیم، لندن میں بھی موجود ہے اور وہاں کی فہرست جلد دوم (صفحہ ۸۶۲ ب ۔ نمبر ۷) میں اس طرح ذکر آتا ہے کہ یہ رسالہ دراصل اس حدیث کی شرح میں ہے۔

لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المؤمن

مصنف کے حالات سوائے ان چند ناموں کے اور کچھ معلوم نہیں۔ البتہ گنج الاسرار۔ گنج العرش جیسی ترکیبیں (کہ ایک لفظ فارسی کا اور ایک عربی کا ہے) گیارھویں صدی ہجری سے پہلے ہمارے ملک میں نظر نہیں آتیں۔ پھر مصنف نے ماہیتِ قلب اور ذکر خفی کا جس انداز سے ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر نقشبندیہ ہے اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مصنف کا زمانہ غالباً غیر منقسم ہندوستان میں گیارھویں صدی ہجری کے بعد ہی رہا ہوگا۔ بہرحال یہ مفید اور نایاب رسالہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ساتھ ہی اردو ترجمہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

## رسالہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز

الحمد للہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد وآلہ اجمعین۔ وسلّم تسلیما کثیراً کثیراً

درویش فرید مسعود سلیمان ابو بکر عمر صلاح غفر اللہ لہ ولوالدیہ کہ ایں رسالہ گنج الاسرار فارسی در بیان شرح معرفت دل و ماہیت آں در قلم آورد و بر چہار فصل بنا نہاد۔

فصل اوّل در معرفت دل۔ فصل دوم در پاس انفاس۔ فصل سوم در شرح دل۔

فصل چہارم در اظہار وحدانیت و آفرینش حضرت آدم صفی صلوٰۃ علیہ ۔ فصل اول در معرفت دل ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکایۃ عن اللہ تعالیٰ لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المؤمن ۔

ازیں مراد وسعت دل بندۂ مومن است ۔ معنی چناں باشد کہ حق تعالیٰ می فرماید نیست در خزانۂ قدرت من نہ اندر زمین و نہ اندر آسمان من مگر آنکہ در فراخ قدرتِ من دل بندۂ مومن است ۔ اکنوں عزیز من اگر گویند دل پارۂ گوشت است بدیں فراخی آسمان و زمین یعنی وسعت دل مومن چوں راست آید گفت ہرگاہ کہ دل مومن بصلح آید ۔ قال علیہ السلام ان فی جسدِ بنی آدم لمضغۃ اذا صلحت صلح بہا سائر الجسد الا وھی القلب واذا فسدت فسد بہا سائر الجسد ۔ یعنی بہ درستی کہ در وجود بنی آدم پارۂ گوشت است چوں او صلاح یافتہ باں جسد صلاح یابد چوں او فساد یافتہ بداں جملہ جسد فساد یابد آں دل است و صلاح دل حاصل نہ شد آنکہ تزکیہ و تصفیہ و تجلیہ نہ کند تزکیہ پاکی نفس است از اوصاف ذمیمہ ۔ پس یقین باید دانست کہ نفس پاک نہ شود مگر از غایت ریاضت و مجاہدت و طاعت تا گوشتہا و خونہا کم نہ شود و اذکار بمغز استخواں رسد و مغز استخواں نیز بگدازد آں گاہ نفس پاک شود ۔ بعد ازاں بحکم حدیث رسول علیہ السلام کار کردہ شود ۔ اتحبون الجنۃ مرا لبعض الغنم فنوالمہ لن فتد خلوھا ابدا حتی تکونوا کالبروۃ الغنی تنزل من السما وذالک اما بالتوبۃ او بالعفوا و بمعنی حدۃ العذاب بقدر الجنایۃ

واصل ایں کم خواری و شب بیداری است و کم خواری و شب بیداری دست نہ دہد تا خشک نہ خورد کہ ہرچند کہ خشک می خورد نفس می کاہد چوں کم خواری بقدر نیم سیر رسد گوشت اندام ہمہ بریزد و خونہا کم شود ۔ عزیز من گرانی جوارح و سستی اندامہا در طاعت تا مادام است کہ گوشتِ اندام کم نہ شدہ است ۔ ہرگاہ کہ گوشت و خون کم شد بعد ازاں جوارح در طاعت سبک آید ۔ آں گاہ ایں چنیں کم خواری و شب بیداری حاصل گردد ۔ و ہمگی طاقت بشری در نوافل بسیار صرف کند خاصہ در شب چنانچہ حق تعالیٰ در قرآن مجید

می فرماید۔ ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً۔ چوں کار بہ استقامت پذیرد نفس پاک شود تزکیہ این است۔ این با جذب صفات حاصل آید وحصول مقصود در تصفیہ دل است تا ازاں گوہر دل پیدا آید و دل صاف نہ شود تا پاس انفاس نہ کنند۔

فصل دوم۔ در پاس انفاس ہر نفس کہ برآید و فرو نشیند مرید را باید کہ ذاکر باشد قال علیہ السلام لکل شئ مصقلۃ ومصقلۃ القلب ذکر اللہ تعالیٰ۔ اکنوں عزیز من پاس انفاس ہر دو نوع است۔ نوع اوّل ذکر جلی۔ نوع دوم ذکر خفی۔ پس مرید را باید کہ در ابتدائے حال در پاس انفاس بذکر جلی مشغول باشد۔ ذکر جلی ذکر زبان است ودر گفتن زبان مراظبت نماید تا حضور حاصل شود واصل حضور آنست کہ زمان ومکان نفس حاصل آید زمان برآمدن نفس است ومکان فرو آمدن نفس است باید کہ برآمدن و فرو آمدن نفس از ذکر اللہ تعالیٰ خالی نباشد۔ آنگاہ از کثرت ذکر جلی ذکر خفی حاصل آید پس سالک را ذکر خدائے عزّ وجل آنست کہ دریں بیست وچہار ساعت کہ در ہر ساعت ہزار نفس است ہمہ در طاعت گذارند۔ آنگاہ سالک راہِ خدائے تعالیٰ باشد۔ اکنوں عزیز من طاعت بر دو نوع است طاعتِ ظاہر وطاعت باطن اوّل حالِ مریداں طاعتِ ظاہری در پاس انفاس وبصوم وصلوٰۃ وکم خوردن وکم گفتن وکم خفتن وذکر زبان کردن است۔ فامّا طاعت باطن در پاس انفاس، ذکر خفی است۔ ساعتے ازاں ساعتہا بیست وچہار ساعت نفس را نگاہ دارد تا حدّ تنگی نفس رسد وورا او ہم ذاکر باشد۔ چوں کار از حدّ تنگی نفس بگذرد وطاقت بشری محو شود۔ ازیں چنیں اشتغال از تنگی انفاس باطن یک ساعت است کہ دراں ساعت تنگی نفس مدخل خطرات نیست۔ ایں بیست وچہار ساعت و بیست وچہار ہزار نفس کہ شبان روز است۔ دریں ساعت در می آید چنانچہ در خبر آمدہ قال النبی علیہ السلام الدنیا ساعۃ فاجعلہا طاعۃ وایں طاعتِ باطن در پاس انفاس بذکر خفی (است) کہ ایں ساعت بہترین ساعتہا است ودر خبر آمدہ است۔ قال علیہ السلام تفکر ساعۃ خیرٌ من عبادۃ ستین سنۃ۔ اے عزیز من مراد ایں تفکر

ساعت پاس انفاس راست، ہرگاہ کہ ساعتے از آں ساعتہا تفکر کند در پاس انفاس
در دم ذاکر باشد تا حدِ تنگی نفس رسد کہ ایں تصفیہ دل است و دل صاف نشود تا در او
وہم ذکر نباشد باید کہ نفس را بندد کہ حدِ تنگی نفس سخت تر است از آتش زیرا چہ
از آتش تنگی نفس پیچھلے کہ گرد دل است بگداز د و پردہ ہائے کہ فرد دینہ است
خشک شود و الخناس مثل کاہ خشک گردد و فرود پردہا نشستگاہِ الخناس است
کہ وے برسرِ سویدائے دل نشستہ است کما قال اللہ تعالیٰ ۔ الخناس الذی
یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس برائے دفع ملعون ساعۃً فساعۃً
بدوام پاس انفاس بذکر مشغول باشد۔ ایں محاربہ کردن است بر الخناس و بر لشکر او و ہوا
اے عزیز من جہاد اکبر آنست کہ در خبر آمدہ است ۔ قال علیہ السلام رجعنا من الجھاد
الاصغرِ الی الجھاد الاکبر مراد پاس انفاس است بذکر خفی۔ ساعتے از ساعتہا
کہ گفتہ شدہ است نفس را بندد تا حدِ تنگی نفس رسد (د) در او ہم ذاکر باشد۔ قال اللہ
تعالیٰ ۔ ادعوا ربکم تضرعاً وخفیۃً ۔ چوں انکار حدِ تنگی نفس بگذرد از طاقت
بشری محو شد۔ پس عمودے از نور جلی حضرت قدس در باطن بندہ فرود آید۔ ایں جا جذب
ذات حاصل آید۔ نفس صفت دل گیرد و دل صفت روح گیرد۔ ازیں روح مراد گنج دل است
کہ دراں گنج ہفت دو دہر گنج گوہر است۔ ایں نور تجلی ایں گوہر ہا را جذب کند و روشن
گرداند۔ الخناس و خطرات و جمیع اوصاف ذمیمہ دفع گردد۔

حکایت عن اللہ تعالیٰ ۔ یا عبدی انا عند ظنک وانا معک اذا دعوتنی
ادعوک ۔ یعنی اے بندہ من۔ من نزدیکِ گمان توام۔ حال اینست کہ من با توام
چوں مرا بخوانی من ترا بخوانم۔ یعنی بندہ از خدائے ہم خدائے را خواہد اکنوں عـزیز من
طاعت باطن اینست۔ پس مرید را باید کہ برائے تصفیۂ دل دم بدم از یاد حق تعالیٰ
(غافل ؟) نباشد۔ زیرا چہ ایں دم ہائے حیواۃ را دایں قالب فانی شمارے نہادہ است
ہر یک نفس کہ می رود از عمر گوہر بستاند کاں را خرج ملک ۔ ہر دو عالم بہا بود۔

مپسند کیں خزانہ دہی رائیگاں بباد　　وانگہ روی بخاک تہی دست و بے نوا

تتمہ انفاس خلاصہ دریادِ حق صرف تا آں دم پیس کہ ایمان بر بستہ آں دم است و تا ایمان
از درمرگ بسلامت برد۔ زیرا چہ وجود شخص در عمر گذشتہ سالہا با ہیں و مہا جیواۃ
بمجہتائے فانی الفت گرفتہ بود از برائے قطع محبتہائے فانی دم بہ دم از یاد حق
تعالیٰ خالی نباشد و یادداشت حق در او ہم ذاکر بودن ست در پاس انفاس
قال اللہ تعالیٰ :- فاذکرونی اذکرکم - چوں بندہ ایں چنیں در یادداشتِ حق
شود خود را فانی بشمرد۔ حضرت عزت را باقی۔ زہے باقی کہ در قالب فانی چوں سالک
در حدّ تنگی نفس دریابد زمان اول ارادہ است ذاکر در برآمدنِ انفاس بذکر جلی ہم مواظبت
نماید تا در دل بکشاید و دل را دو درّہ است یکے بالا و دوم فرودِ برآمدن انفاس از در بالا
(و) آں کشادہ نگردد مگر از کثرتِ ذکر جلی۔

فصل سوم در شرح دل۔ عزیز من، صورتِ دل بمثل گل نیلوفر است دو رخ
دارد۔ و ہر دو رخ الخناس فرود گر است بمثل عنکبوت تنہ کردہ و بافتہ و پردہ با فرو
ہشتہ۔ قرارگاہِ او فرود پردہا ست و دل نیز پردہا دارد بمثل پردہائے گل نیلوفر
(کہ) در پردہائے الخناس است۔ پس سالکِ راہ خدائے تعالیٰ در زمان برآمدن نفس
باید کہ بذکر جلی مشغول باشد۔ از کثرتِ ذکر جلی در بالا آئینۂ دل کشادہ شود و درون دل
ہفت پہلو است و در پہلوئے جائے گوہر است۔ اوّل گوہر ذکر است۔ دوم گوہر
عشق۔ سوم گوہر محبت۔ چہارم گوہر سر است۔ پنجم گوہر روح است ششم گوہر معرفت
است۔ ہفتم گوہر فقر است۔ دل را بسبب ایں معنی گنج خوانند و الخناس موکل است۔
بریں گنج عزیز من درون دل غلیظ است۔ پاک نشود مگر بپاس انفاس و پاس
انفاس ہر دو نوع است۔ یکے ذکر جلی، دوم ذکر خفی۔ درون و بیرونِ دل بعلت بسیار
غلیظ شدہ است۔ از غذا ہائے نا وجہ و محبتہائے فانی و صورت الخناس مثل صورت
اژدہا بینی کہ خرطوم دارد۔ سر خرطوم خارے پر زہر گاہ کہ مرید طعام ناوجہ می خورد الخناس
ذوق می گیرد و خرطوم خاردار گرد دل می گرداند و زہر خار می کند۔ خطرات و محبتہائے فانی
و جملہ اوصاف ذمیمہ از آنجا متولّد می شود۔ پس عزیز من حصول تصفیۂ دل در ملّت

اکل است واصل قلتِ اکل، خشک خوردن است وپاس انفاس۔ تا صورت الخناس ضعیف شود۔ و پیچہائے غلیظ بگدازد و پردہ ہا گرد فرودینہ است خشک شود۔ و در پاس انفاس بذکر جلی مشغول شود۔ بعدازاں در بالا آئینہ دل کشادہ گردد نوع دوم در پاس انفاس ذکر خفی است کہ نفس را بند دو در وہم ذاکر باشد تا کار حدِ تنگی نفس رسد۔ پردھا کہ درون دل کشادہ گردد و درون دل غلیظی کہ ہست بردود۔ و ہر ہفت پہلو کہ اندرون دل است جائے گوہر، سالہا بسیار از غذا ہائے نا وجہ کہ ہوائے نفس تصرف کردہ است از شومتِ آں اثر گوہر ہا سیاہ مکدر شدہ است و از وصف خود بے وصف گشتند۔ ہرگاہ کہ سالک ساعتے از ساعتہا کہ گفتہ امر پاس انفاس کند بذکر خفی و نفس را بند دتا از حرارت تنگی نفس کہ دروہا کہ درون ہفت پہلو است مصفا شود و آں ہر ہفت گوہر بر صفت خود باز آید و در فرودینہ سخت تنگی است و پردہا در فرودینہ را سوراخ مثل باریک سوزن است۔ چندانی نفس بند دتا نفس ازیں سوراخ بیروں آید قال اللہ تعالیٰ حتیٰ یلج الجملُ فی سم الخیاط۔ ایں سوراخ در فرودینہ کہ سالہا می گذشتہ مسدود شدہ است کشادہ نگردد، کشادہ نگردد، کشادہ نگردد، تا تزکیہ و تصفیہ و تجلیہ نکند۔ عزیز من ایں عمر از برائے حصول سہ مراتب است، شریعت و طریقت و حقیقت حصول شریعت در تزکیہ نفس است بہ کم خوردن و نوافل بسیار کردن، خاصہ در شب، وحصول طریقت در تصفیہ دل است در صوم و پاس انفاس بذکر جلی وحصول حقیقت در تجلیہ روح است بداشتن روز ہا طے پاس انفاس بذکر خفی بعدازاں در فرودینہ دل کشادہ گردد تجلیہ آں جا حاصل شود قال اللہ تعالیٰ انا جلیس من ذکرنی۔ اینجا درست آید۔ حق تعالیٰ می فرماید من ہم نشیں آں کم کہ مرا یاد کند۔ حق تعالیٰ بندہ را بوصف نزدیک باشد و بوصف بودن آنست کہ ہفت گوہر کہ درون گنج است روشن شود، اوّل وصف گوہر ذکر ظاہر شود وصف وجود گوہر ذکر آنست کہ در موجود منفرد گرداند یا عبدی انا عندظنک و انا معک اذا دعوتنی ذکراً کثیراً ایں جا حاصل شود من احب شیئاً

اکثر ذکرہ وہم ذاکر بود۔ یا ایہا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا۔ بیت

باش اے ذاکر مدام از تفرقہ دور | ہاں نشوی بذکر ظاہر مغرور
نفس و دل و روح تا نگردند یکے | واحد نشود ذاکر و ذکر و مذکور

بعدازاں وصف گوہر عشق ظاہر گردد و وصف گوہر عشق آنست کہ ہم شوق و اشتیاق و درد و اندوہ و جوانی با خواست مولیٰ در وے پدید آید۔ بعدازاں وصفِ گوہر محبت ظاہر گردد۔ وصف گوہر محبت آنست کہ دل خالی باشد کہ ہمہ حال رضائے او جوید و خدائے عزّوجل از بندہ نیز راضی باشد۔ بعدازاں وصف گوہر سر ظاہر گردد و وصف گوہر سر آنست کہ آگاہی از واردات مواہب الٰہی بندہ را می دہد۔ بعدازاں وصف گوہر روح ظاہر شود و وصف گوہر روح آنست کہ ہیچ ساعتے ازآں ساعتہا کہ گفتہ شدہ است از طاعتہائے حق تعالیٰ خالی نباشد بعدازاں وصف گوہر معرفت ظاہر گردد و وصف گوہر معرفت آنست کہ ہرچہ بیند حق بیند و ہرچہ شنود حق شنود و ہرچہ گوید حق گوید و ہرچہ می رود حق می رود۔ بعدازاں وصف گوہرِ فقر پیدا شود و وصف گوہر فقر آنست کہ از کل اشیا مستغنی باشد۔

فصل چہارم۔ در اظہار و حاجت و آفرینش مہتر آدم صلواۃ اللہ علیہ۔ قال اللہ تعالیٰ۔ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لاعرف۔ یعنی گنج پنہاں بودم۔ دوست داشتم کہ شناختہ شوم پس بیافریدم خلق را تا شناختہ شوم۔ وایں گنج دل است القلب بیت الرب ہے۔ ایں جا درست آید۔ اکنوں تحقیق دل کہ حرم خاص خدا بیست و حرم خاص اصل صورت دل است و اصل صورت دل پارہ گوشت نیست بلکہ صورت دل گوہر است و اصل گوہرِ دل نور است وایں نور از نور خدا ایست عزوجل۔ چنانچہ در خبر آمدہ است۔ قال علیہ السلام۔ انا من نور اللہ والمومنون من نوری قال اللہ تعالیٰ اللہ نور السموات والارض...... اے منور ھما یعنی روشن کنندہ آسمان و زمین یعنی راہ نمایندہ اہل آسمان و زمین و ہادی اھلھا اگر خدائے عزوجل را نور گویم وصف عرض لازم آید و آں جائز نیست و او عرض و جسم و جوہر

نیست۔ خدائے تعالیٰ روشن کنندۂ آسمانہا و زمینہا است۔ اے عزیز من از یں مراد روشنی است۔ بشنو کہ چگونہ روشن گردانیدہ است۔ حضرت عزت جل جلالہ پیش از خلقت خلق واحد و احد و فرد و صمد و حی و قیوم بود و ہست و ارادت و مشیت خواست کہ واحدیتِ خود را آشکار کند۔

اوّل نور روح محمد را صلی اللہ علیہ وسلم بیافرید۔ پس نورِ دل را بیافرید و ایں نورِ دل نور خدائے است۔ پیغامبر فرمود صلی اللہ علیہ وسلم انا من نور اللہ و المومنون من نوری معنی چناں باشد کہ من از نور خدائم و مومناں از نور من و آفرینش ایں نور دل سہ لک ہشتاد ہزار سال فراخی بود۔ حکایت من اللہ تعالیٰ لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن۔

مراد ازیں وسعت نور دل است چنانچہ حق تعالیٰ می فرماید، نیست در فراخی قدرت من نہ زمین و نہ آسمانِ مگر آنکہ در فراخیٔ قدرت من دل بندۂ مومن و آں نور دل است۔ حضرت عزت جل جلالہ ایں نور دل را صد ہزار سال در قبضۂ قدرت خود پرورش می داد و کلمۂ محبت می شنوانید یا عبدی انت عشقی و محبی و انا عشق لک و محب لک۔ ای بندۂ من تو عاشق منی و محب منی و من نیز عاشق توام و محب توام و دریں نہ صد ہزار سال نظر کرامت و کشف انوار جمال تجلّی می کرد۔ بعد ازاں نہ صد ہزار سال از قبضۂ قدرت جدا گردانید آں نور دل التماس کرد الٰہی سیّدی بندہ را طاقت فراق نیست چندیں ہزار سال بعشق و محبت پرورش دادی۔ اکنوں جدا نتوانم شد فرمان حضرت عزت جل جلالہ شد کہ ای بندۂ من ترا بر خواست حق کارے نیست۔ ما ترا برائے اظہار وحدانیت خود آفریدہ ایم۔ بعد ازاں نور دل از درد فراق نہ صد ہزار سال دیگر در عالم تحیّر مستغرق ماند بعد ازاں در جدائی و از مرحمت خدائی چنداں آب از دیدہ بارید کہ دریائے گشت آں را بحر الحیوان گویند۔ حضرت عزت جل جلالہ تازیانۂ قہر، نور دل را بزد از غلبۂ قہر باد آتش پیدا شد و از سختی تازیانۂ قہر دو نور آتشیں شد۔

یکے نورِ عزازیل، دوم نور گندم بعد ازاں ایں نور دل نہ صد ہزار سال چوں چرخ می گشت

و اجزائے نورِ دل ذرہ ذرہ می شد۔ بعد ازاں اجزا دلازی نورِ دل را حضرت عزت سہ قسم گرد انید۔

قسم اوّل سرہا آفرید۔ و از قسم دوم جانہا آفرید و از قسم سوم نورہا آفرید۔ بعد ازاں نورِ دل را منکسر گردانید۔ انا عند منکسرة القلوب لاجلی۔ حضرت عزت جل و علا می فرماید کہ من نزدیک شکستہ دلانم۔ بعد ازاں حق تعالیٰ بقیہ اجزائے نور گوہر دل را نہ صد ہزار سال دیگر بنظر حکمت پرورش داد۔ بعد ازاں از بقیہ اجزائے نور گوہر دل این دہ گوہر را آفرید۔ اوّل گوہر آسمانہا و زمینہا۔ دوم گوہر عرش۔ سوم گوہر کرسی چہارم گوہر روح۔ پنجم گوہر قلم۔ ششم گوہر بیت المعمور۔ ہفتم گوہر بہشت ہشتم گوہر دوزخ نہم گوہر شمس۔ دہم گوہر قمر آفرید۔ کار عالم حق جلّ و علا این دہ گوہر از گوہر دل آفریدہ است چنانچہ در خبر آمدہ است۔ قلب المومن اکبر من العرش و اوسع من الکرسی معنی چناں باشد کہ دل مومن بزرگ تر از عرش و فراخ تر از کرسی است آں گوہر دل را از جہت دو معنی اکبر خوانند یکے آنکہ این دہ گوہر نتیجۂ گوہر دل اند۔ دوم آنکہ حضرتِ عزت این دو گوہر را (دل) گردانیدہ است و درین گنج ہفت گنج است و در ہر گنج گوہر نہادہ است۔

اول گوہر عشق۔ دوم گوہر محبت۔ سوم گوہر سر۔ چہارم گوہر روح۔ پنجم گوہر معرفت۔ ششم گوہر فقر۔ ہفتم گوہر ذکر است۔ حق جل و علا این گنج دل را چند ہزار سال در عالم غیب نہادہ است تا کہ خاک آدم صلوات اللہ علیہ جمع گردانید و خمیر کرد چنانچہ در خبر آمدہ است کہ خمرتُ طینة آدم بیدی اربعین صباحاً۔

حق تعالیٰ خمیر کرد گل آدم را بید قدرتِ خود چہل صباح بعد ازاں ترکیب قالب بجوف و طاق سینہ نہاد و این گنج در طاق سینہ داشت و جملہ اسمار اورا معلوم گردانید

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

# ترجمہ رسالہ گنج الاسرار

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علیٰ رسولہٖ محمد وآلہٖ اجمعین وسلم تسلیماً کثیراً۔

فارسی کا یہ رسالہ گنج الاسرار دل کی معرفت اور اس کی ماہیت کی شرح کے بیان ہیں، درویش فرید مسعود سلیمان ابوبکر عمر صلاح، غفر اللہ لہٗ ولوالدیہٖ نے قلم بند کیا اور چار فصلوں پر اس کی بنیاد رکھی۔ پہلی فصل دل کی معرفت کے ذکر میں دوسری فصل پاس انفاس کے بیان میں تیسری فصل دل کی تشریح میں چوتھی فصل وحدانیت اور حضرت آدم صفی اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیدائش کے بارے میں۔

فصل اوّل معرفت دل کے بارے میں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن۔

میری سمائی کے لئے میری زمین اور میرے آسمان کی وسعت کافی نہیں البتہ میرے مومن بندے کا دل میرے سمانے کے لئے کافی ہے۔ اس کا مقصد مومن بندے کے دل کی وسعت جتانا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ آسمان وزمین میں اتنی فراخی نہیں ہے جتنی کہ بندۂ مومن کے دل میں ہے۔ اے میرے عزیز! اب اگر یہ کہیں کہ زمین وآسمان کی اس بے پایانی کے مقابلے میں دل گوشت کا ایک ٹکڑا ہے یعنی قلب مومن کی وسعت کس طرح صحیح ثابت ہوسکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ مومن کا دل صالح ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بنی آدم کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم ٹھیک رہتا ہے آگاہ کہ وہ یہی دل ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔"

مطلب یہ کہ بنی آدم کے وجود میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب تک وہ ٹھیک رہتا جسم بھی ٹھیک رہتا ہے۔ جب وہ خراب ہوجاتا ہے تو جسم بھی خراب ہوجاتا ہے اور وہ ٹکڑا

دل ہے اور دل کی صلاح (درستی) تزکیہ (پاک کرنے) تصفیہ (صاف کرنے) اور تجلیہ (جلا دینے) سے حاصل ہوتی ہے۔ تزکیہ نام ہے نفس کو بری باتوں سے پاک رکھنے کا بس یقین جاننا چاہیئے کہ نفس اس وقت تک پاک نہیں ہوگا جب تک کہ اطاعت مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت سے گوشت اور خون کم نہ ہو جائے۔ اور بات ہڈی کے گودے تک پہنچ جائے۔ اور ہڈی کا گودا (بھی) پگھل جائے۔ تب کہیں نفس پاک ہوگا۔ اس کے بعد جاکر کہیں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل ہوگا۔ جس میں آپ نے فرمایا ہے کیا کیا تم لوگوں نے جنت کو بکریوں کی چراگاہیں سمجھ رکھا ہے خدا کی قسم تم اس میں کبھی نہ داخل ہوگے تا وقتیکہ بدلی کے ان اولوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہ آسمان سے نازل ہوتے ہیں اور یہ بات یا تو توبہ سے حاصل ہو سکتی ہے یا عذوسے یا گناہ کے برابر عذاب کی مدت گذرنے سے اور اس کی بنیاد کم کھانا اور رات کا جاگنا ہے۔ (لیکن) کم خوری اور شب بیداری حاصل ہوتی ہے روکھا سوکھا کھانے سے روکھا سوکھا کھانے سے نفس کمزور ہو جاتا ہے اور جب کم خوری بقدر نیم سیری (آدھا پیٹ) رہ جاتی ہے تو جسم کا گوشت گل جاتا ہے اور خون کم ہو جاتا ہے اے میرے عزیز! اطاعت اور عبادت میں بدن اور اعضا وجوارح کی سستی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ جسم کا گوشت کم نہیں ہو جاتا۔

گوشت اور خون گھٹ جانے کے بعد اعضا وجوارح اطاعت میں چست ہو جاتے ہیں اس وقت اس قدر کم خوری اور شب بیداری حاصل ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی طاقت کثرت نوافل میں صرف کی جائے۔ خاص کر رات میں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ سبحانہ قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔

ومن اللیل فتہجد بہ نافلۃ لک عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا (اور رات کے بعض حصے تہجد میں گذارو کہ تمہارے لئے شئی زائد ہے ممکن ہے تم کو تمہارا پروردگار مقام محمود پر فائز کردے) جب عمل استواری سے ہمکنار ہوتا ہے تو نفس پاک ہو جاتا ہے اور اسی کو تزکیہ کہتے ہیں۔ یہاں اس مقام پر صفات (الہی) کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مقصود کا حصول دل کی تطہیر میں ہے تاکہ اس عمل سے گو ہر دل پیدا ہو

اور دل صاف نہیں ہوتا جب تک کہ پاس انفاس نہ کیا جائے۔

فصل دوم پاس انفاس کے ذکر میں۔

ہر سانس جو کہ باہر آتا ہے اور اندر جاتا ہے اس میں مرید کو چاہیئے کہ ذاکر رہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر چیز کی صیقل کی جاتی ہے اور دل کی صیقل گری اللہ تعالے کا ذکر کرتا ہے اے میرے عزیز! پاس انفاس کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم ذکر جلی، اور دوسری قسم ذکر خفی۔ پس مرید کو چاہیئے کہ ابتدائے حال میں پاس انفاس کے وقت ذکر جلی میں مشغول رہے۔ ذکر جلی زبان کا ذکر ہے زبان سے ذکر کرنے سے مداومت رکھے تاکہ حضور حاصل ہو۔ اور اصل حضور یہ ہے کہ سانس کا زمان و مکان (حاصل ہو) زمان سانس کا باہر آنا ہے اور مکان سانس کا اندر آنا ہے۔ چاہیئے کہ سانس کا باہر آنا اور اندر آنا کوئی بھی ذکر الٰہی سے خالی نہ ہو۔ اس وقت ذکر جلی کی کثرت سے ذکر خفی حاصل ہوگا۔ پس سالک کے لئے خدائے بزرگ و برتر کا ذکر وہ ہے کہ ان کے ہر گھنٹہ میں ہزار سانس ہے تمام کے تمام اطاعت میں گزارے اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی راہ کا سالک کہلائے گا۔

اب اے عزیز سن! اطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ظاہری اطاعت اور (۲) باطنی اطاعت مرید کے لئے پہلے اطاعت ظاہری ہے کہ پاس انفاس میں صوم و صلوٰۃ کی پابندی کم کھانا۔ کم بولنا کم سونا۔ اور زبان سے ذکر کرنا ہے۔ رہی پاس انفاس میں اطاعت باطنی تو وہ ذکر خفی ہے۔

اس کی ایک گھڑی چوبیس گھنٹے نفس کی حفاظت کرتی ہے یہاں تک کہ تنگئ نفس کی منزل آجائے اور اس میں بھی ذاکر رہنا چاہیئے۔ اور جب معاملہ تنگئ نفس کی حد سے آگے نکل جائے اور بشری طاقت محو ہوجائے تو انفاس باطنی کی تنگی کے باعث ایک ایسی گھڑی آتی ہے کہ اس میں تنگی نفس کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ اور وہ وساوس سے محفوظ رہتی ہے یہ چوبیس گھڑیاں اور چوبیس ہزار سانسیں جو کہ دن کی محافظ ہیں اسی گھڑی میں آتی ہیں۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ الدنیا ساعۃ فاجعلھا طاعۃ (دنیا گھڑی بھر کی ہے سو اس کو اطاعت بنالو) اور پاس انفاس میں یہ اطاعتِ باطن ذکر خفی ہے یہ گھڑی بہترین گھڑی ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تفکر ساعۃ خیرٌ من عبادۃِ ستین سنۃ (ایک گھڑی کا غور و فکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر

اے میرے عزیز! اس ایک گھڑی کے غور و فکر سے مراد پاس انفاس ہے پاس انفاس میں اگر ایک ساعت تفکر کرے تو اس میں بھی ذاکر رہے یہاں تک کہ تنگی نفس کی حد میں داخل ہو جائے اس لئے کہ یہی تصفیۂ دل ہے۔ اور دل صاف نہیں ہوتا تا وقتیکہ اس میں ذکر نہ ہو

چاہیئے کہ نفس کو باندھ رکھے اس لئے کہ تنگی نفس کی منزل آگ سے زیادہ دشوار ہے کیونکہ تنگی نفس کی آگ سے دل کے گرد کی چربی پگھلتی ہے اور چربی کے قریب جو پردے ہیں وہ خشک ہو جاتے ہیں اور شیطان تنکے کے مانند خشک ہو جاتا ہے اور پردوں کے پیچھے شیطان کی بیٹھک نشست گاہ ہے۔ اس لئے کہ وہ دل کے سویدا کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا الخناس الذی یوسوس فی الصدور الناس من الجنۃ والناس (شیطان جو کہ لوگوں کے دلوں میں برے خیالات ڈالتا ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ شیطان لعین کو دور کرنے کے لئے ہمہ وقت پاس انفاس کے دائمی عمل کے ساتھ ذکر میں مشغول رہے یہ شیطان اور اسکے لشکر اور خواہش نفس کے خلاف جنگ کرنا ہے۔

اے میرے عزیز! سب سے بڑا جہاد وہ ہے جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے۔ اس سے پاس انفاس مراد ہے جو ذکر خفی کے ساتھ ہو۔

جن سات [illegible] کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک ساعت سانس کو روکنے اور باندھنے کی صرف کرے یہاں تک کہ تنگی نفس کی حد آ جائے۔ اور اس میں بھی ذاکر رہے اللہ تعالےٰ نے فرمایا ادعوا ربکم تضرعاً و خفیۃ (اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چھپ کر پکارو) جب تنگی نفس کی منزل طے ہو جائے تو اس سے طاقت بشری محو ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد حضرت قدس کے نور کی ایک لکیر بندہ کے باطن میں داخل ہوتی ہے۔ اس مقام پر جذب ذات الٰہی حاصل ہوتا ہے نفس دل کی صفت اختیار کر لیتا ہے اور دل میں روح کی صفت پیدا ہو جاتی ہے

اس روح سے مراد دل کا خزانہ ہے اس خزانے میں سات خزانے ہیں اور ہر خزانے میں موتی ہیں۔ نور تجلی ان موتیوں کو جذب کرتا ہے اور ان کو تابندہ کرتا ہے۔ خناس (شیطان) برے خیالات (خطرات) اور تمام مذموم اوصاف دور ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ سے منقول ہے یا عبدی انا عند ظنک وانا معک اذا دعوتنی ادعوک۔ یعنی اے میرے بندے میں تیرے گمان کے قریب ہوں

حال یہ ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں جب تو مجھے پکارتا ہے میں تجھے آواز دیتا ہوں۔ یعنی بندہ خدا سے بھی خدا ہی کو چاہتا ہے۔

اب اے میرے عزیز! طاعت باطن یہی ہے پس مرید کو چاہیئے کہ اپنے دل کی صفائی (تصفیہ) کے لئے کسی لمحہ حق تعالےٰ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ اسی لئے زندگی کے ان سانسوں کو اس فانی جسم میں اہمیت حاصل ہے۔ ہر سانس اپنے ساتھ عمر کا موتی لے جاتا ہے۔ جس کی قیمت دونوں جہان کی خراج ہی ہو سکتا ہے ؎

اس خزانے کو رائیگاں مت دے
جب کہ جاتا ہے تجھ کو خالی ہاتھ

انفاس کی تکمیل فاصکر یاد حق میں آخری سانس تک اسی وقت ممکن ہے جب تک ایمان اس کے ساتھ ہے اور جب کہ ایمان موت کے دروازے سے صحیح سلامت نکل جائے۔ چونکہ شخص کا وجود گزشتہ عمر میں سالہا سال زندگی کے دموں کے ساتھ فانی کی محبت میں گرفتار رہ چکا ہوتا ہے اس لئے فانی کی محبت کو ختم کرنے کے لئے چاہیئے کہ کوئی لمحہ یاد حق سے خالی نہ رہے اور اللہ کی یاد پاس انفاس میں ذاکر رہنا ہے اللہ تعالےٰ نے فرمایا "پس مجھے یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔" جب بندہ اس حد تک یاد حق میں محو ہو جائے تو خود کو فانی شمار کرتا ہے۔ اور حق تعالےٰ کو باقی۔ کیا خوب ہے وہ باقی کہ فانی کے قالب میں جاگزیں ہوتا ہے۔ جب سالک تنگئ نفس کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو زبان اول ارادہ ہے۔ ذاکر نفس کی آمد و شد کے ساتھ مداومت اختیار کرتا ہے یہاں تک دل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور دل کے دو حصے ہیں ایک بالا دوسرا زیریں۔ نفس کا اخراج بالائی دروازے سے ہوتا ہے اور یہ دروازہ ذکر جلی کے بغیر کشادہ نہیں ہوتا۔

تیسری فصل دل کی شرح کے بارے میں۔

میرے عزیز! دل کی شکل گل نیلوفر کے مانند ہے جس کے دو رخ ہیں اور ہر دو رخ شیطان (خناس) کی فرودگاہیں شیطان نے اس کے گرد مکڑی کی طرح جالا بن رکھا ہے اور پردے چھوڑ رکھے ہیں۔ اور شیطان کی کمین گاہ انہی پردوں کے نیچے ہے۔ اور دل کے بھی پردے ہیں۔

گل نیلوفر کے پردوں کی طرح - انہی پردوں میں خناس رہتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی راہ کے سالک کو سانس باہر آنے کے وقت چاہیئے کہ ذکر جلی میں مشغول رہے - ذکرِ جلی کی کثرت سے دل کا بالائی دروازہ کشادہ ہو جاتا ہے - اور دل کا اندرونی حصہ ہفت پہلو ہے اور ہر پہلو میں ایک موتی ہے - پہلا موتی ذکر ہے - دوسرا موتی عشق تیسرا موتی محبت، چوتھا موتی راز دسرا ہے پانچواں موتی روح ہے - چھٹا موتی معرفت ہے اور ساتواں موتی فقر ہے دل کو اسی لحاظ سے گنج کہتے ہیں - اور شیطان اسی خزانے کا پہریدار ہے -

میرے عزیز! دل کا اندرونی حصہ گندہ ہے جو بغیر پاس انفاس کے پاک نہیں ہوتا اور پاس انفاس دو قسم پر ہے ایک ذکرِ جلی دوم ذکرِ خفی - دل کا اندر اور باہر بہت ہی آلائشوں سے گندہ ہو چکا ہے - ناپاک غذائیں اور فانی اشیاء کی محبت اسے غلیظ کر دیتی ہے خناس کی شکل اژدہے کی مانند ہے جس کے خرطوم (سونڈ) ہے اور سونڈ کا سرا زہر سے بھرا ہوا ڈنک ہے جس وقت کہ مرید ناپاک کھانا کھاتا ہے خناس مزے لیتا ہے - اپنی نیش دار سونڈ دل کے گرد پھراتا ہے اور زہر خاری کرتا ہے - وساوس، فانی اشیاء کی محبت اور تمام بُرے اوصاف وہیں سے پیدا ہوتے ہیں - پس میرے عزیز! دل کی صفائی کم کھانے سے حاصل ہوتی ہے اور کم کھانے کی اصل خشک چیز بن کھانا اور پاس انفاس ہے تاکہ خناس کا جسم کمزور ہو جائے اور موٹی چربی پگھل جائے اور جو پردے کہ نچلے حصے میں ہیں خشک ہو جائیں - اور چاہیئے کہ پاس انفاس میں ذکرِ جلی کے ساتھ مشغول رہے - اس کے بعد دل کے بالائی حصے کا دروازہ کشادہ ہو جائے گا۔

پاس انفاس کی دوسری قسم ذکرِ خفی ہے جو کہ نفس کو باندھتا ہے اور اس میں بھی ذاکر رہنا چاہیئے تاکہ تنگیٔ نفس کا مقام حاصل ہو جائے دل کے پردے کشادہ ہو جائیں اور دل کے اندر کی گندگی ختم ہو جائے اور وہ سات گوشے جو کہ دل کے اندر موتی کی پرورش گاہ ہیں ناپاک غذا اور نفس کی عملداری کے سبب ان کے موتی میلے اور سیاہ ہو جاتے ہیں اور اپنی خوبی کھو بیٹھتے ہیں -

سالک ذکرِ خفی کے ساتھ پاس انفاس کرے اور سانس کو باندھے یہاں تک کہ تنگیٔ نفس کی حرارت سے سات گوشوں کے اندر جمع شدہ میل صاف ہو جائے اور وہ صاف موتی اپنی اپنی صفت بحال کر لیں - فرودینہ (دل کے اندرونی حصے) میں سخت تنگی ہے اور فرودینہ کے پردوں

میں سوئی کے ناکے جیسا باریک سوراخ ہے نفس کو اس حد تک تنگ کرنا چاہیئے کہ وہ اس سوراخ کے راستے باہر نکل آئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

حتیٰ یلج الجمل فی سم الخیاط (یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے) فرودینہ کا یہ سوراخ امتدادِ زمانہ سے بند ہو گیا ہے۔ وہ نہیں کھلے گا۔ نہیں کھلے گا، نہیں کھلے گا۔ تاوقتیکہ تزکیہ اور تصفیہ اور تجلیہ نہ کیا جائے گا۔ میرے عزیز! یہ عمر تین درجوں کے حصول کے لئے ہے شریعت، طریقت، حقیقت، حصول شریعت کی کنجی تزکیۂ نفس میں ہے جو کم کھانے اور کثرت نوافل میں خصوصاً ہنگام شب، سے حاصل ہوتا ہے۔ اور حصول طریقت کی کنجی تصفیہ دل میں ہے جو روزہ اور ذکر جلی کے ساتھ پاس انفاس سے حاصل ہوتا ہے اور حصول حقیقت کی کنجی تجلیہ روح میں ہے جو ذکر خفی کے ساتھ پاس انفاس میں گذارنے سے حاصل ہوتا ہے اس کے بعد فرودینہ دل کا دروازہ کھل جاتا ہے اور تجلیہ کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ میں اس شخص کا ہم نشین ہوں جو مجھے یاد کرتا ہے۔ اسی مقام کے لئے ہے اور ذوق آتا ہے اللہ تعالیٰ بندہ کے نزدیک۔ اس کے وصف کی وجہ سے ہوتا ہے اور وصف کا مطلب یہ ہے کہ وہ سات موتی جو خزانے کے اندر ہیں روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلے ذاکر کا وصف ظاہر ہوتا ہے۔ گوہر ذکر کے وجود کا وصف یہ ہے کہ خدا کو موجود میں یکتا سمجھے۔

یا عبدی انا عند ظنک وانا معک اذا دعوتنی ذکرا کثیرا (اے میرے بندے میں تیرے ظن کے قریب ہوں اور میں تیرے ساتھ ہوتا ہوں جب تو مجھے بہت بہت پکارتا ہے) اسی مقام پر حاصل ہوتا ہے۔

جو چیز محبوب ہوتی ہے اس کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے، اس حال میں بھی ذاکر رہنا چاہیئے یا ایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا۔ (اے وہ لوگ کہ ایمان لائے اللہ کو بہت بہت یاد کرو)

باش اے ذاکر مدام از تفرقہ دور — ہاں نشوی بذکر ظاہر مغرور
نفس و دل و روح تا نگردد یکے — واحد نشود ذاکر و ذکر و مذکور

(اے ذاکر تفرقہ سے دور رہ۔ اور ذکر ظاہری پھر سے مغرور نہ ہو۔ جب تک نفس دل اور روح ایک نہ ہو جائیں ذاکر، ذکر اور مذکور ایک نہیں ہو سکتے۔)

اس کے بعد گوہر عشق کا وصف ظاہر ہوتا ہے۔ اور گوہر عشق کا وصف یہ ہے کہ شوق و اشتیاق درد و غم اور جوانی آقا کی طلب میں دفن ہوں۔ اس کے بعد گوہر محبت کا وصف ظاہر ہوتا ہے گوہر محبت کا وصف یہ ہے کہ دل یکسو ہو کر ہر حال میں اس کی رضا جوئی کرے اور خدائے عزو وجل بھی بندہ سے راضی ہو۔ اس کے بعد گوہر سر کا وصف ظاہر ہوتا ہے اور گوہر سر کا وصف یہ ہے کہ واردات و عطیات الٰہی سے بندہ کو آگاہ کرے اس کے بعد گوہر روح کا وصف ظاہر ہوتا ہے۔ اور گوہر روح کا وصف یہ ہے کہ جن لمحات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کوئی لمحہ حق تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے خالی نہ ہو۔ اسکے بعد گوہر معرفت کا وصف ظاہر ہوتا ہے گوہر معرفت کا وصف یہ ہے کہ جو کچھ دیکھے حق دیکھے جو کچھ سنے حق سنے جو کچھ کہے حق کہے اور جو کچھ چلے حق چلے۔ اس کے بعد گوہر فقر کا وصف پیدا ہوتا ہے اور گوہر فقر کا وصف یہ ہے کہ جملہ اشیاء سے بے نیاز ہو جائے۔

فصل چہارم۔ اظہار وحدانیت اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لاعرف میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے چاہا کہ جانا جاؤں اس لئے میں نے خلق کو پیدا کیا۔ اور یہ خزانہ دل ہے۔ القلب بیت الرب (دل پروردگار کا گھر ہے) اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ دل خدائے تعالیٰ کا حرم خاص ہے۔ اور حرم خاص دل کی اصل صورت ہے اور دل کی اصل صورت گوشت کا ٹکڑا نہیں ہے بلکہ دل کی اصل صورت موتی ہے۔ اور دل کے موتی کی اصل نور ہے اور یہ نور اللہ تعالیٰ کے نور کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اللہ کے نور سے ہوں اور تمام مومن میرے نور سے ہیں۔ ارشاد باری ہے اللہ نور السموات والارض (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) یعنی انہیں منور کرنے والا ہے زمین و آسمان کو روشن کرنے والا۔ یعنی اہل زمین و آسمان کو راہ دکھانے والا اور ان کے باطن کا رہبر اگر خدائے تعالیٰ کو نور کہیں تو عرض کا وصف لازم آتا ہے اور یہ جائز نہیں اس لئے کہ وہ عرض جسم یا جوہر نہیں ہے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا روشن کرنے والا ہے۔

اے میرے عزیز! اس سے مراد روشنی ہے سنو کہ کس طرح اس نے روشن کیا ہے۔ اللہ جل شانہ

خلق کو پیدا کرنے سے پہلے واحد اور احد اور فرد اور صمد اور حی اور قیوم تھا اور ہے۔
مشیت مقتضی ہوئی کہ اپنی واحدیت کو آشکارا کرے۔ اول روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کا نور پیدا کیا۔ پیچھے دل کے نور کو پیدا کیا۔ اور یہ نورِ دل نورِ خدا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا (میں اللہ کے نور سے ہوں اور مومنین میرے نور سے ہیں) مطلب یہ ہوگا میں
اللہ کے نور سے ہوں اور مومن میرے نور سے۔ اس نورِ دل کی پیدائش طول میں تین لاکھ
اسی ہزار سال اور عرض میں تین لاکھ اسی ہزار سال کو محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے
لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن (میں نہ زمین
میں سما سکتا ہوں نہ آسمان میں البتہ بندۂ مومن کا دل میرے سمانے کے لئے کافی ہے)
اس سے مقصود نورِ دل کی وسعت بتانا ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میری قدرت کی
فراخی کو نہ میری زمین پہنچ سکتی ہے نہ میرا آسمان البتہ بندہ مومن کا دل فراخی میں میری قدرت
کے برابر ہے۔ اور وہ نورِ دل ہے اللہ جل شانہ نے اس نورِ دل کو نو سو ہزار سال (۹ لاکھ)
اپنے قبضۂ قدرت میں رکھ کر پرورش کیا۔ اور یہ کلمہ محبت اس کے کان میں پھونکا۔ اے
میرے بندے تو میرا عاشق تو میری محبت ہے اور میں تیرے لئے عشق، تیرے لئے محبت
ہوں۔ مراد یہ کہ اے میرے بندے تو میرا عاشق ہے تو میرا محب ہے اور میں بھی تیرا
عاشق ہوں، تیرا محب ہوں۔ اور ان نو سو ہزار سالوں میں نظر کرم اور انوار جمال کا کشف
پر تو افگن رہا۔ اس کے بعد نو سو ہزار سال قبضۂ قدرت سے جدا رکھا۔ نورِ دل نے التجا کی
میرے معبود میرے آقا غلام کو فراق کی طاقت نہیں اتنے ہزار سال تو نے عشق و محبت
سے پرورش کیا۔ اب میں جدا نہیں رہ سکتا۔ فرمان خداوندی صادر ہوا اے میرے بندے
تجھے خدا کی مرضی میں کوئی دخل نہیں۔ ہم نے تم کو اپنی وحدانیت کے اظہار کے لئے پیدا کیا
ہے اس کے بعد نورِ دل نو سو ہزار سال مزید درد جدائی کا مارا عالم تحیر میں ڈوبا رہا۔ اس کے
بعد درد جدائی سے اور رحمت خداوندی سے آنکھ نے اتنا پانی برسایا کہ دریا بہہ نکلا۔
اس کو بحر حیوان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے قہر کا تازیانہ نورِ دل کو مارا قہر کے غلبہ
سے ہوا اور آگ پیدا ہوئی۔ اور قہر کے تازیانہ کی سختی سے دو آتشیں نور نکلے۔ ایک نورِ

عزازیل۔ دوم نورِ گندم۔ اس کے بعد یہ نورِ دل نو سو ہزار سال چرخ کی مانند چکر کاٹتا رہا۔
اور نورِ دل کے اجزا ذروں میں تبدیل ہوگئے۔

اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے نورِ دل کے اجزار کو تین قسم میں بانٹ دیا۔ پہلی قسم سے سر پیدا کئے دوسری قسم سے جانیں پیدا کیں اور تیسری قسم سے نور پیدا کئے۔ اس کے بعد نورِ دل کو منکسر بنادیا۔ انا عند منکسرۃ القلوب لاجلی حضرت جل شانہ فرماتے ہیں میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے قریب ہوں۔ اس کے بعد حق تعالیٰ گوہرِ دل کے نور کے بقیہ اجزا کو نو سو ہزار سال مزید نظرِ حکمت کے ساتھ پرورش کیا۔ اس کے بعد گوہرِ دل کے نور کے بقیہ اجزا سے یہ دس گوہر پیدا کئے۔

اول زمینوں اور آسمانوں کا گوہر دوم گوہرِ عرش۔ سوم گوہرِ کرسی، چہارم گوہرِ لوح پنجم گوہرِ قلم۔ ششم گوہرِ بیت المعمور۔ ہفتم گوہرِ بہشت۔ ہشتم گوہرِ دوزخ نہم گوہرِ شمس۔ دہم گوہرِ قمر پیدا کیا۔

حق تعالےٰ نے یہ دس گوہر دل کے گوہر سے پیدا کئے ہیں چنانچہ حدیث ہیں قلب المومن اکبر من العرش واوسع من الکرسی۔ مومن کا دل عرش سے بڑا ہے کرسی سے کشادہ اس گوہرِ دل کو دو لحاظ سے بڑا کہتے ہیں۔

ایک یہ کہ یہ دس گوہر گوہرِ دل کا نتیجہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالےٰ نے ان دس گوہر کو دل بنادیا۔ اس گنج ہیں سات گنج ہیں اور ہر گنج ہیں گوہر رکھے ہیں۔ اول گوہرِ عشق دوم گوہرِ محبت، سوم گوہرِ سر، چہارم گوہرِ روح۔ پنجم گوہرِ معرفت ششم گوہرِ فقر ہفتم گوہرِ ذکر ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اس گنج دل کو کئی ہزار سال عالمِ غیب ہیں پوشیدہ رکھا تاکہ آدم علیہ السلام کی مٹی کو جمع کرے اور خمیر بنائے۔ چنانچہ حدیث ہیں آیا ہے۔ خمرت طینۃ آدم بیدی اربعین صباحاً۔ اللہ تعالےٰ نے آدم کی مٹی کو اپنے دستِ قدرت سے چالیس صبح تک خمیر کیا اسکے بعد سینے اور پیٹ کے ساتھ قالب کو ترتیب دیا۔ اور اس گنج کو طاق سینہ ہیں رکھا اور تمام اسمار اس کو بتادیئے۔ وعلم آدم الاسمار کلھا۔

# لمحات

شاہ ولی اللہ کی حکمت الہی کی یہ بنیادی کتاب ہے اس میں وجود سے کائنات
کے ظہور، تدلی اور تجلیات پر بحث ہے یہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی۔
مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخے کی تصحیح اور تشریحی حواشی اور
مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قیمت:۔ دو روپے

123822
22.3.95

# سطعات

انسان کی نفسی تکمیل و ترقی کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک
متعین فرمایا ہے اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے
ذریعہ جس طرح حظیرۃ القدس سے اتصال پیدا کرتا ہے سطعات میں اسے بیان کیا گیا ہے

قیمت:۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لیے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنّفوں کی کتابیں شائع کرنا۔